مجھے تو حیران کر گیا وہ
احمد عقیل روبی
ناصر کاظمی کی زندگی کا شخصی خاکہ

احمد عقیل رُوبی کا اندازِ تحریر رواں ہے منفرد ہے اور بے تکلفانہ ہے۔ مجھے یہ کتاب پسند آئی اور اِتنی پسند آئی کہ جی چاہتا ہے کہ دل کھول کر داد دُوں اور کہوں کہ لکھیے، لکھیے اور خوب لکھیے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی

احمد عقیل روبی
ہے تم میں ایک خوبی
لکھتے ہو تم جو خاکہ
ہوتا ہے وہ بلا کا
جیسے وہ شخص یاں سے
اُٹھ کر ابھی گیا ہے
آنکھوں میں اُسکی صورت
رہ رہ کے گھومتی ہے
کانوں میں بات اُسکی
تھم تھم کے گونجتی ہے

ڈاکٹر خورشید رضوی

ناصر کاظمی کا خاکہ، خاکہ نگاری کی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی

احمد عقیل رُوبی کا شیوۂ تحریر دلچسپ، رواں اور بھرپور ہے جو نہ صرف اس کا ترجمان ہے بلکہ پڑھنے والے کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ اُردو میں خاکہ نویسی تقریباً ناپید ہے۔ اس صنف میں سعادت حسن منٹو کے بعد احمد عقیل روبی نے رنگ جمایا ہے۔

ڈاکٹر انیس ناگی
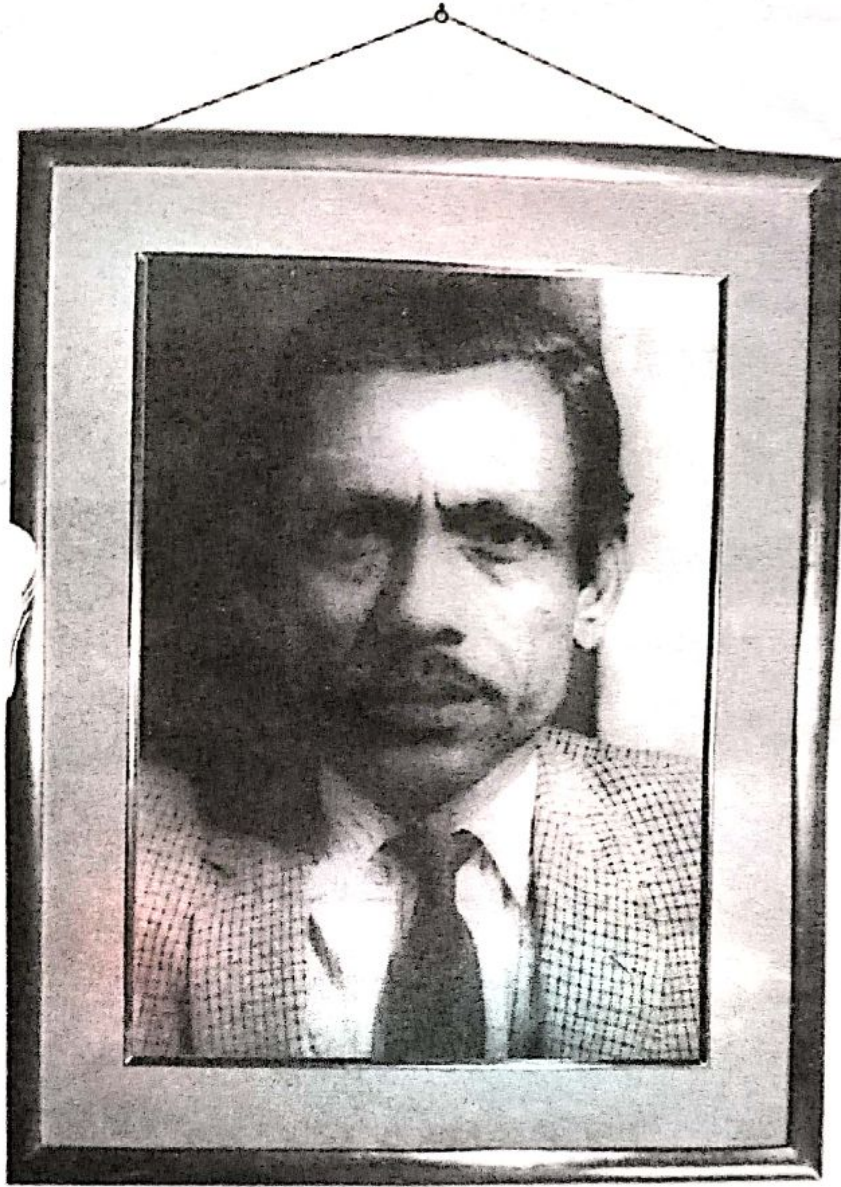
دائم آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہونگے کوئی ہم سا ہوگا

ناصر کاظمی

ناصر کاظمی کی موت پر

سکوت کی راہ گزر پہ کب سے
خموشیوں کی ردا تنی ہے
ہوا کی چلتی ہوئی سواری
درخت کی شاخ پر رکی ہے
اداسیوں کی قبا میں لپٹے
صدا کے لاشے پڑے ہوئے ہیں
حسین سورج کا زرد پتھر
خلیج مغرب میں گر گیا ہے
تھکا تھکا سا گھنا اندھیرا
دبیز پتوں پہ جم گیا ہے
رواں دواں وقت تھم گیا ہے

شفیقہ بھابی، باصر کاظمی
حسن کاظمی
اور عنصر کاظمی کے نام

تمہاری کتاب ''مجھے تو حیران کر گیا وہ'' میں جو چیز نمایاں طور پر اور جلیل ہے وہ ناصر کاظمی کے ساتھ تمہاری حقیقی دردمند نوازی اور Understanding ہے۔ اس میں ناصر کاظمی چلتے پھرتے ہنستے کھیلتے زندگی گزارتے نظر آتے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا ایسے Portraits پہلے کسی نے اس خوبی سے اردو میں لکھے ہوں۔ ماسوا مرزا فرحت بیگ دہلوی کی ''ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' کے''

محمد خالد اختر (مرحوم)

ناصر کاظمی کا شخصی خاکہ اور عقیل روبی کا ڈرامائی انداز تحریر گویا سونے پر سہاگہ۔ ناصر کاظمی شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ساحر بھی تھا جو اپنی گفتگو سے مسحور کر دیتا تھا۔ عقیل روبی ایک مصور ہے جو رنگین لفظوں سے حقیقت پسندانہ تصوریں بناتا ہے۔

شخصی خاکہ ایک ایسی صنف ادب ہے جس میں داستان کی سی رنگینی اور سوانح عمری کی سی صداقت ہونی چاہیے۔ عقیل روبی نے ناصر کاظمی کی داستانوی شخصیت کو ایسی دلکشی سے دکھایا ہے کہ اس سے شخصی طور پر کبھی نہ ملنے والے بھی اس متحرک عکاسی کی مدد سے اسے دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے حلقہ اثر میں بیٹھ سکتے ہیں اور اس کی گفتگو سے متاثر ہو سکتے ہیں اور یہ کام ایسے خلوص صداقت اور بیباکی کے ساتھ کیا گیا ہے کہ اس طرح کی اور مثالیں آسانی سے دستیاب نہیں ہوتیں۔

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

''مجھے تو حیران کر گیا وہ'' چند معروضات

تکمیل وجود کی خواہش ہر انسان میں کسی نہ کسی صورت میں موجود ہوتی ہے۔ اور یہ تکمیل اپنی ذات میں ممکن نہیں بلکہ اس کے لئے کسی دوسری ہستی اور وہ بھی عام ہستی نہیں بلکہ مثالی ہستی کا موجود ہونا لازمی ہے۔ اور بعض شخصیات ایسی ہوتی ہیں جنہیں انسان موجود دیکھنا چاہتا ہے چنانچہ یہ خواہش کبھی تو مثالی انسان کے خاکے کی صورت میں صورت پذیر ہوتی رہی تو کبھی ''مرزا نامہ'' نوعیت کی تحریروں میں تو کبھی سوانح نگاری اور خاکہ نگاری کی صورت میں۔ ''مجھے تو حیران کر گیا وہ'' احمد عقیل روبی کا تحریر کردہ ناصر کاظمی کا ایسا ہی شخصی خاکہ ہے. جس میں ناصر کاظمی کا جیتا جاگتا انسانی وجود نظر آتا ہے۔

احمد عقیل روبی ناصر کاظمی کی سحر انگیز شخصیت سے متاثر ہیں لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ اس چھتنار شخصیت کے سائے میں اپنی شخصیت کو گم نہیں ہونے دیتے بلکہ ناصر کاظمی کی شخصیت کی دریافت احمد عقیل روبی کی شخصیت کے انکشاف کے حوالے سے ہوتی ہے۔ بقول خواجہ زکریا صاحب ناصر کاظمی ایک ساحر بھی تھا جو اپنی گفتگو سے مسحور کر دیتا تھا عقیل روبی ایک مصور ہے جو رنگین لفظوں سے حقیقت پسندانہ تصوریں بناتا ہے۔'' ماضی کو تخلیقی سطح پر زندہ کر دینا آسان کام نہیں جو احمد عقیل روبی نے کر دکھایا ہے۔ جسے پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ ادب کا مطالعہ بیدار اوقات فرصت کے گزارنے کا نام نہیں بلکہ اپنے کو بیدار کرنے، متحرک زندگی گزارنے، لطف و ہمدردی اور ادراک کی صلاحیتوں میں زور اور قوت پیدا کرتا ہے۔ اور ادب کا اثر ایک گھنٹہ نہیں دن کے چوبیس گھنٹے رہتا ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد نے ''مجھے حیران کر گیا وہ'' کی اس خصوصیت

کو "سحر" سے تعبیر کیا ہے۔ اور افتخار عارف کو یہ خاک "رلا" گیا ہے۔ اصل میں ہر فن کے بے
رابطہ آفرینی لازمی عنصر ہے۔ یہ رابطہ شاعری میں افکار، تمثالوں جذبات اور بالخصوص اصوات کی
باہم آہنگی سے پیدا ہوتا ہے۔ جیسے کہ مصوری میں رنگ و خطوط سے فن تعمیر اور مجسمہ سازی میں حجم
اور تناسب سے اور موسیقی میں درجہ ارتعاش اور حرکت سے وجود میں آتا ہے احمد عقیل روبی کے
یہاں یہ رابطہ آفرینی اتنی مضبوط ہے کہ قاری اپنے آپ کو ان کے پیش کردہ ماحول کو محض دیکھتا
نہیں بلکہ اس میں خود کو شامل سمجھتا ہے۔ احمد عقیل روبی لفظوں کے حسن، معنویت اور کردار کا شعور
رکھتے ہیں۔ اور یہ بات ادب کا ہر قاری جانتا ہے کہ لفظ کو تجربہ اور تجربہ کو لفظ سے غیر متعلق کر کے
نہیں دیکھا جا سکتا۔ "مجھے تو حیران کر گیا وہ" کی نثر میں لفظ خود بتاتے ہیں کہ لکھنے والے نے ایک
ایک لفظ کو اپنے تجربے کی تہہ سے نکال کر اس طرح تراشا ہے کہ جیسے وہ پہلی مرتبہ گھڑ کر سامنے
آئے ہوں۔ درحقیقت لفظ کا صحیح استعمال اور صحیح موقع محل ہر کام میں لایا جانا اس کے ظاہری،
معنوی حسن کو دوبالا کر دیتا ہے۔ جس طرح کسی لفظ کو بے ربط الفاظ کے ساتھ استعمال آنا خواہ وہ
کیسا ہی عمدہ اور خوبصورت کیوں نہ ہو اسے بھونڈا اور کریہہ بنا دیتا ہے۔

احمد عقیل روبی ناصر کاظمی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اس طرح ترتیب دیتے
ہیں، انتخاب کرتے ہیں کہ بقول قاضی جاوید "یہ ثابت کرتے ہیں کہ مختصر کتاب بھی بڑی کتاب
ہو سکتی ہے۔" یوں تو زندگی کا ہر تجربہ ذہن پر اپنے نقش چھوڑ جاتا ہے مگر ضروری نہیں کہ یہ نقوش
ادب کی شکل بھی اختیار کریں۔ اپنی آخری شکل میں آنے سے پہلے انہیں تخیل اور تجربے کی تہوں
سے گزرنا پڑتا ہے۔ ذہنی تجربے کی اس تکمیل کا نام ادب ہے۔ احمد عقیل روبی جب کوئی واقعہ لکھتے
ہیں تو پہلے اس کا منظر دیکھتے ہیں۔ اور پھر اس منظر کو مکمل کر کے قاری کو دکھاتے ہیں۔ چیخوف کا
کہنا تھا کہ اگر کوئی افسانہ نگار کسی افسانے میں دیوار پر لگی تلوار دکھاتا ہے تو اس تلوار کا استعمال بھی
آئندہ صفحات میں ہونا چاہیے۔ "مجھے تو حیران کر گیا وہ" پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ اس میں احمد
عقیل روبی نے وہی کچھ دکھایا ہے جو ناصر کاظمی کی شخصیت اور ان کے عہد کو مکمل کرنے کے لئے
ضروری تھا۔ کسی حقیقت کو تخلیقی سطح پر پیش کرنا۔ اپنی قوت ارادی کو بروئے کار لا کر اسے متغیر یا

منقلب کرنے کا عمل ہے اس عمل سے انسان کسی شے کی ماہیت تک پہنچتا ہے۔ اشیا کی ماہیت بھی
انسانی تصرف میں آنے کے بعد ہی کھلتی ہے کہ وہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے چنانچہ انسان کی حقیقت کو
بدلتے ہوئے عمل ہی میں پہنچایا جا سکتا ہے کہ کس طرح وہ اپنے ماحول کے بدلنے سے تبدیل ہوتا
ہے۔ اس کی اس تفسیر پذیری کا ادراک ہی اس کی حقیقت کا ادراک ہے۔ ناصر کاظمی کی شخصیت
جامد شخصیت نہیں بلکہ حرکی شخصیت تھی۔ جسے اپنی اصل صورت میں احمد عقیل روبی نے ہمارے
سامنے پیش کیا ہے۔ جسے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے۔ شخصیت محض عادات کا مجموعہ نہیں ہوتی بلکہ طبعی
اور سماجی ماحول میں اپنے آپ کو برقرار رکھنے اور اسی جدوجہد میں زندگی کو نفسیاتی اور روحانی سطح پر
مالا مال کرنے کا نام ہے۔

ادب میں حقیقت تین زاویوں سے شامل ہوتی ہے۔ واقعہ، واقعیت اور زندگی کی
ماہیت جس طرح انسان خارجی حقائق سے رشتہ جوڑ کر اپنے وجود کی تکمیل کرتا ہے احمد عقیل روبی کا
تخیل سارے علوم کی دریافتوں کو اپنے اندر سمو کر ادب تخلیق کرتا ہے اور اس بہانے اس متحرک
انسان کی حقیقت دریافت کرتا ہے جو وقت کے بہتے ہوئے دھارے میں مسلسل اپنے اندر اور
باہر کے انکشاف سے دوچار ہے۔ اور اس عمل میں احمد عقیل روبی کا اسلوب ایسا ہے کہ ان کی تحریر
خود کو پڑھواتی چلی جاتی ہے۔ اس لئے ڈاکٹر جمیل جالبی احمد عقیل روبی سے یہ کہتے ہیں۔

"احمد عقیل روبی کا انداز تحریر رواں ہے۔ منفرد ہے اور بے تکلفانہ ہے۔ مجھے یہ کتاب
بہت پسند آئی ہے اور اتنی پسند آئی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ دل کھول کر داد دوں اور کہوں کہ لکھیے،
لکھیے اور خوب لکھیے۔"

ڈاکٹر باقر علی شاہ

سیکھے

''مجھے تو حیران کر گیا وہ'' پہلی بار ۱۹۹۴ء میں چھپی۔ ناصر کاظمی سے دل چسپی رکھنے والوں نے اسے بہت پسند کیا۔ جنہیں ناصر کاظمی سے دل چسپی نہیں تھی یہ کتاب پڑھ کر وہ ناصر کاظمی کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھنے لگے۔ کتاب کی مقبولیت میں ناصر کاظمی کی افسانوی شخصیت کا بڑا عمل دخل تھا۔ جس کی وجہ سے میری عزت میں بھی اضافہ ہوگیا۔

ناصر کاظمی اور سجاد باقر رضوی سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ علم (جتنا میری سمجھ میں آیا) میں نے باقر صاحب سے لیا۔ علم کو پڑیوں میں باندھ کر بازار حیات میں دکان کھول کر بیچنے کا گُر ناصر کاظمی سے سیکھا۔ ناصر کاظمی تھیلے سے بلی نکال کر لوگوں کو حیرت زدہ کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ میں نے ان کا پیچھا کرتے، ان کے ساتھ ساتھ چل پھر کر چوری چوری اُن سے یہ گُر سیکھنے کی کوشش کی جتنے منتر، جتنا گُر ان کی جیب سے نکال سکا نکال لیا۔ اب شعر و سخن کی سجا جما کر انہیں استعمال میں لاتا ہوں۔ بات بنے یا نہ بنے اس کی مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ مقصد صرف یہ ہے کہ بات چلتی رہے اور سجا جمتی رہے۔

ناصر کاظمی کے بارے میں جو میں نے لکھا وہ کافی نہیں نامکمل ہے۔ کہنے کو ابھی بہت کچھ ہے۔ جتنا وقت میں نے ان کے ساتھ گزارا اس وقت میں ناصر بھائی جتنے میرے ہاتھ لگے میں نے الفاظ میں قید کر لئے۔ جو وقت میرے ساتھ نہیں گزارا اس وقت کی باتیں ابھی باقی ہیں۔ وقت ملا زندگی رہی تو وہ باتیں بھی ہو جائیں گی۔

''مجھے تو حیران کر گیا وہ'' پڑھ کر یار دوستوں نے میرا بڑا حوصلہ بڑھایا۔ انتظار حسین،

عبداللہ حسین، افتخار عارف، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر رشید امجد، ڈاکٹر انیس ناگی، صدیقہ بیگم، مظفر علی سید، ڈاکٹر سہیل احمد خان، شعیب بن عزیز اور خاص طور پر مرحومہ شفیقہ بھابھی (بیگم ناصر کاظمی) باصر کاظمی، عنصر کاظمی، حسن کاظمی۔ انیس اکرام فطرت نے جن الفاظ میں داد دی اس سے میں تازہ دم ہو گیا ہوں۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن آپ کے سامنے ہے اسے پڑھیے شاید اس کا کوئی حرف آپ کی آنکھ میں چمک اٹھے اور مجھے میری محنت کا ثمر مل جائے۔

احمد عقیل روبی

قدیم یونان کے ایک شہزادے نے شادی کے لئے دلہن کے انتخاب کی عجیب و غریب شرط رکھی تھی اور وہ یہ کہ جو لڑکی مختلف پھولوں سے دیدہ زیب اور خوبصورت ہار بنائے گی وہ اس کی بیوی ہوگی۔ شادی کی بہت سی امیدوار دوشیزائیں ڈھیروں پھول لے کر آئیں اور ہار گوندھے لیکن ایک لڑکی نے چند پھولوں کو اتنے سلیقے سے ہار میں پرویا کہ شہزادے کو وہ ہار بھا گیا اور ڈھیروں پھولوں والیاں منہ دیکھتی رہ گئیں۔

مجھے یہ کہانی کئی بار یاد آئی اور ناصر کاظمی پر جب بھی لکھنے کے لئے قلم اٹھایا گھنٹوں لیٹا چھت کو تکتا رہا اور آخر کار قلم بند کیا کاغذ سمیٹ کر ایک طرف رکھے اور سو گیا۔ مشکل یہ ہے کہ ناصر کاظمی کے ساتھ گزارے دس پندرہ سالوں کی یادوں کا ایک ڈھیر میرے سامنے ہے لیکن ہار میں پرونے کا وہ سلیقہ نہیں جو منتخب ہونے والی لڑکی کو آتا تھا لیکن اب یہ سوچ کر قلم اٹھایا ہے کہ ضروری تو نہیں کہ آدمی ہر امتحان میں کامیاب ہی ہو جائے ناکامی کا بھی ایک اپنا مزہ ہے۔ اس کا لطف کیوں نہ لیا جائے اور پھر ناصر کاظمی نے تو ساری زندگی ناکامیوں سے جنگ لڑی ہے۔ برے دلوں میں اچھے دنوں کی آس میں دکھ جھیلے ہیں نہ صرف خود بلکہ دوسروں کو یہ کہہ کر زندہ رہنے کا حوصلہ دیا ہے۔

وقت اچھا بھی آئے گا ناصر
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

حالات کی دلدل میں گردن تک دھنسے ہوئے جب میں نے یہ شعر اپنے دوست گوہر

نوشاہی سے سنا تو محسوس کیا کہ ہماری طرح ناصر کاظمی کے حالات بھی کچھ زیادہ اچھے نہیں۔ ناصر کاظمی سے ملنے کی پیاس اور بڑھ گئی اور جب پیاسے کی کنوئیں سے ملاقات ہوئی تو محسوس ہوا کہ پیاس تو بجھ گئی ہے مگر نیت نہیں بھری۔ ناصر کاظمی سے مل کر مجھے دھان پان سائنس دان لوئی پاسچر کا وہ خط یاد آ گیا جو اس نے اپنے استاد کی بیٹی کو لکھا تھا۔ لوئی پاسچر ناصر کاظمی کی طرح دبلا پتلا تنہا تنہا، ذہین، بلا کا جملہ باز تھا۔ لڑکیاں اس کی صحت اور غربت کی وجہ سے دور بھاگتی تھیں لیکن اس کی خواہش تھی کہ نسوانی آواز کا کوئی تو سر اس کے کانوں میں اترے۔ وہ اپنے تجربات کے سلسلے میں ایک سائنس دان کی لیبارٹری میں ملازم ہو گیا۔ سائنس دان کی خوبصورت بیٹی اس سے دور دور رہتی تھی۔ ایک دن لوئی پاسچر نے ایک کاغذ لے کر اسے خط لکھا:

''میرا نام لوئی پاسچر ہے مجھے اپنے باپ سے ورثے میں کچھ نقد رقم ملی تھی جو میرے لئے فضول تھی۔ میں نے وہ اپنی بہن کو دے دی ہے۔ اب میرے پاس کمزور صحت ہے ڈھیر ساری ذہانت ہے اور خوبصورت گفتگو ہے جو مجھے ایک بار ملتا ہے واپس نہیں جاتا۔ آپ ایک بار مل کر دیکھ لیں آزمائش شرط ہے۔''

فقط

لوئی پاسچر

وہ لڑکی خط پڑھ کر اسے ملنے آئی اور پھر دونوں کی شادی ہو گی۔ ناصر کاظمی سے مل کر مجھے بھی کچھ ایسے ہی محسوس ہوا۔ قینچی کا سگریٹ انگلیوں میں دبا کر جب وہ کش لیتے اور دھواں چھوڑتے تو ایسا محسوس ہوتا جیسے خوبصورت فقرے سونے کے سنہری چشمے سے نہا کر ہونٹوں سے گر رہے ہیں اور سننے والا حیرانی میں منہ کھولے ناصر کاظمی کو دیکھ رہا ہے۔

اردو شاعری کے اس لوئی پاسچر سے گوہر نوشاہی کی وساطت سے میری پہلی ملاقات ناصر کاظمی کے گھر میں ہوئی۔ یہ ۱۹۶۱ء کہ بات ہے۔! ناصر کاظمی سے ذہنی اور قلبی رابطہ ''برگ نے'' کے ہاتھ آتے ہی قائم ہو گیا تھا لیکن ناصر کاظمی سے آشنائی اور اس کی صحبت میں بیٹھنے اور

ویران راستوں پر چلنے کا اعزاز کچھ عرصے بعد نصیب ہوا۔

۱۹۶۰ء میں انوار انجم مرحوم اور میں شمع تاثیر کے سالانہ مشاعرہ میں ایمرسن کالج ملتان کی طرف سے شرکت کرنے لاہور آئے تو پتہ چلا کہ یہاں تو ہر کوئی شعروں پر ناصر کاظمی کی چھاپ اور گلے میں اس کی عقیدت اور محبت کا طوق ڈالے گھوم رہا ہے۔ لاہور کے طالب علم اور جوان شاعر ناصر کاظمی کی باتوں سے محفلیں سجاتے تھے اور شعروں سے دلوں کی بزم روشن کرتے تھے۔ مجھے مشاعرہ میں شرکت کی خوشی نہ تھی بس یہ بات دل میں گدگدی کر رہی تھی کہ ناصر کاظمی سے ملاقات ہوگی کیونکہ منصفین میں ایک نام ناصر کاظمی کا بھی تھا۔ باقی دو حضرات سجاد باقر رضوی اور انجم رومانی تھے۔ مشاعرہ شروع ہوا۔ باقر صاحب اور انجم رومانی کے درمیان ایک بے چین سا آدمی ہر پل اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ سگریٹ انگلیوں میں دبی ہوئی تھی وقفے وقفے کے بعد اپنے ہونٹوں سے لگاتا تھا۔ ہر پندرہ منٹ بعد اٹھ کر باہر جاتا اور پھر لوٹ آتا گوہر نوشاہی نے کہا ''یہی ہیں ناصر کاظمی''۔

مشاعرہ ختم ہوا انعامات تقسیم ہوئے۔ گوہر نوشاہی کے ساتھ لڑکوں کے ہجوم کو چیرتا ہوا میں جب وہاں پہنچا جہاں منصفین بیٹھے تھے تو ناصر کاظمی جا چکے تھے۔ باقر صاحب اور انجم رومانی موجود تھے۔ باقر صاحب نے مجھ سے میرا نام پوچھا اور پھر کہنے لگے۔ ''غزل تمہاری اچھی تھی لیکن زبان بے حد کمزور۔ نہ جانے تم نوجوان شعر کہتے وقت زبان کی طرف دھیان کیوں نہیں دیتے؟'' میں نے کہا ''جی کوشش کروں گا''۔ باقر صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی اور میرا دل ناصر کاظمی سے ملاقات نہ ہونے پر ملول تھا۔ گوہر نوشاہی کہنے لگا ''یار فکر نہ کر کل صبح ناصر کے گھر چلیں گے۔ تم اپنی ایک دو غزلیں بھی رکھ لینا وہ نوجوان شعراء کا کلام سن کر بہت خوش ہوتے ہیں''۔ میں گفتگو کا آخری ٹکڑا سن کر پریشان ہو گیا بلکہ ڈر گیا۔ رات کو چپکے سے اٹھا اور ٹرین پکڑ کر ملتان چلا گیا بالکل مصور وان گاف کی طرح جو دو سو میل پیدل چل کر اپنی محبوبہ کے شہر گیا۔ گھر کے دروازے تک پہنچا لیکن دستک دیئے بغیر واپس لوٹ گیا۔

انور انجم مجھ سے ایک سال سینئر تھا اس نے اورینٹل کالج میں ایم۔ اے اردو میں

ملنے لاہور آیا تو گوہر نوشاہی ارشاد راؤ (جسے دوست
داخلہ لے لیا تھا۔ میں چھٹیوں میں اس سے
ملانے لے گئے۔ گھر پہنچ دستک دی ناصر جو اس وقت بہت
سکھ کہتے تھے) مجھے ناصر کاظمی سے
A.G آفس میں کلرک تھے) باہر آئے
چھوٹا تھا۔ عنصر کاظمی (ناصر کے چھوٹے بھائی جو اس وقت
بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ناصر کاظمی
بتایا کہ بھائی اوپر کبوتروں کو دانہ ڈال رہے ہیں ہم کمرے میں
آ گئے علی گڑھ کٹ پاجامہ، ململ کا کرتا، ہاتھ میں سگریٹ منہ میں پان اور آنکھوں میں چمک ہم

کھڑے ہو گئے۔

سگریٹ کی ڈبیہ میز پر رکھی گوہر نوشاہی نے ناصر کاظمی سے کہا ''بھائی جان یہ عقیل روبی ہیں ہمارے بہت اچھے دوست ہیں اور آپ کے بے حد دلدادہ۔''

ناصر نے جواب دیا۔ ''چھوڑو یار میں تو فضول سا آدمی ہوں مجھے کون دل دے گا اگر یہ فضولیات پسند کرتے ہیں تو میں حاضر ہوں میرا خیال ہے کہ یہ وہی روبی ہیں جن کے بارے میں تم نے شعر سنایا تھا

روبی ملتان جا کے خط لکھنا
ویسے مرضی ہے چاہے مت لکھنا

''جی جی'' گوہر نے ہنس کر کہا۔

ناصر میری طرف مخاطب ہو کر کہنے لگے۔ ''بس ٹھیک ہے تم سے ہماری دوستی نبھ جائے گی کیونکہ گوہر نے ہمیشہ ٹھیک آدمی سے ملوایا ہے۔'' چائے آ گئی اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں انہیں آفس جانا تھا ہم ان کی باتوں کی خوشبو لے کر واپس لوٹ آئے اور پھر یہی خوشبو بار بار گھیر کے ان کے پاس لے جاتی رہی اور ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ میں چھٹیاں گزار کر واپس ملتان آنے لگا تو کہنے لگے۔

''ملتان میں کہاں رہتے ہو؟''

''سول ہسپتال کے پیچھے ترین روڈ پر۔''

''اچھا کبھی ملتان آنا ہوا تو ضرور آؤں گا۔''

میں ملتان واپس آ گیا۔ غالباً کے آخری دن تھا۔ اللہ وسایا ملتان کے ایک مل اونر قتیل شفائی کے قریبی دوست تھے۔ کوئٹہ کے مشاعرہ سے واپسی پر قتیل شفائی احمد ندیم قاسمی صاحب کے ساتھ ملتان رکے اللہ وسایا کے ہاں دعوت تھی۔ ریاض انور حبیب پاسلوی قتیل شفائی احمد ندیم قاسمی ارشد ملتانی نے محفل جمائی۔ مجھے قتیل صاحب نے اپنے پروگرام کی اطلاع پہلے سے دے دی تھی۔ میں بھی وہاں چلا گیا۔ ریاض انور سے پتہ چلا کہ مظفر وارثی کوئٹہ میں باتھ روم گیا اور کموڈ ٹوٹ گیا اور وہ زخمی ہو گیا۔ دوسری اطلاع یہ تھی کہ ناصر کاظمی اور اسلم انصاری کوئٹہ گئے اکٹھے تھے مگر واپسی الگ الگ ہوئی۔ میں نے پوچھا:

''کیوں؟''

ریاض انور نے سگریٹ کا کش لے کر کہا۔

''ناصر کاظمی کولوں پچھ۔''

شعر و سخن کی یہ محفل رات ۲ بجے ختم ہوئی۔ شدید بارش نے پورے شہر کو جل تھل کر دیا تھا۔ میں کپکپاتا گرتا پڑتا اپنے گھر کے قریب پہنچا تو ٹی سٹال کا مالک فرید کمبل اوڑھے مدہم سی روشنی کے پاس بیٹھا اونگھ رہا تھا مجھے دیکھ کر چونکا اور پوری آنکھیں کھول کر بولا۔

''آج آپ نے مروا دیا بابو جی!''

''کیوں کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں ہوا۔'' وہ کمبل ایک طرف رکھ کر کھڑا ہوا اور اندر کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

''اندر چلئے کوئٹہ سے آپ کے مہمان آئے ہیں۔''

میں نے بہت سوچا کہ کوئٹہ میں میرا کون ہے۔ جب یادداشت نے کوئی خاطر خواہ جواب نہ دیا تو میں دکان کے اندر داخل ہو گیا۔ حیرانی نے میرے قدم روک دئے۔ دیکھا کہ انگیٹھی پر دونوں ہاتھ پھیلائے ناصر کاظمی بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے سلام کیا ناصر کاظمی نے جواب دیا اور پھر کہنے لگے۔

''کہاں آوارہ گردی کرتے پھر رہے ہو؟ پڑھائی کی طرف کوئی دھیان ہی نہیں۔''

میں نے کچھ کہنا چاہا تو کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے۔

''بس بس میرا سامان اٹھاؤ اور چلو اپنے چوبارے پر۔''

میں سامان اٹھا کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ بستر بچھایا وہ لیٹ گئے چائے بنائی چائے پی کر کہنے لگے۔

''میں کوئٹہ مشاعرہ پر گیا تھا واپسی پر یہاں اتر گیا سوچا تم سے ملتا چلوں۔''

''یہ میری خوش قسمتی ہے ناصر بھائی''

میں نے کہا

''تمہاری خوش قسمتی نہیں میری خود غرضی ہے۔'' ناصر کاظمی بولے۔

''خود غرضی وہ کیسے؟''

''وہ ایسے کہ مجھے تمہاری ضرورت تھی اور ضروریات پوری کرنا خود غرضی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تردید کی جرات نہیں لیکن میں پوری طرح آپ سے متفق نہیں۔''

چائے کی پیالی میز پر رکھ کر ناصر نے رضائی اپنے چاروں طرف لپیٹی اور سگریٹ لگا کر کہنے لگے۔

''تم خوش قسمتی کے حق میں ہو اور میں خود غرضی کے، درست کون ہے اس کے لئے کسی تیسرے آدمی کا ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ تم ابھی جاؤ اور اسلم انصاری کو بلا لاؤ۔''

باہر شدید بارش ہو رہی تھی سڑکوں پر ایک ایک فٹ پانی چل رہا تھا۔ شدید سردی میں ہاتھ پاؤں ٹھٹھر رہے تھے لیکن میں ناصر کاظمی کی بات سن کر چپ چاپ سیڑھیاں اتر کر سڑک پر آ گیا۔ ہوٹل کا مالک فرید کمبل اوڑھے کھڑا تھا اس نے پوچھا۔

''اب کیا پروگرام ہے؟''

''پاک گیٹ جانا ہے''

''اس موسم میں۔''

''موسم اس سے اگر خراب بھی ہو تو بھی۔'' میں نے کہا۔ ''کیوں؟'' فرید نے کمبل

اچھی طرح لپیٹتے ہوئے کہا۔

''اسم انصاری کو بلا کر لانا ہے۔''

''یہ کون ہے؟''

''تم نہیں جانتے۔''

میں فرید کو جواب دے کر پانی میں شب شب کرتا آگے بڑھا تو دکان سے ایک ڈنڈا اٹھا کر فرید بھی میرے ساتھ ہو لیا۔ وہ اس موسم میں مجھے تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ میں فرید ٹی سٹال والے کے لئے بڑا اہم آدمی تھا۔ فرید ان پڑھ کالا کلوٹا انتھونی کوئن کا ہم شکل تھا۔ گرلز کالج کی چپڑاسن سے عشق کرتا۔ وہ بھی اس پر مرتی تھی۔ پانچ جماعتیں پڑھی ہوئی تھی۔ فرید عشقیہ خط اللہ وسائی کو مجھ سے لکھواتا تھا۔ اس کے بدلے میں وہ مجھے چائے ناشتہ اور ڈھیر ساری محبت دیتا تھا۔

اسلم انصاری کا گھر حرم گیٹ سے آگے پاک گیٹ کے قریب تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے لئے حرم گیٹ کے ''ریڈ لائٹ ایریا'' میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ جہاں نشے میں دھت شرابی، ناکام عاشق، ۱۰۹ میں چالان کرنے والے پولیس کے سپاہی صحت مند آوارہ کتے اور دلال عام پائے جاتے تھے۔ میں اور فرید ان سب سے بچ بچا کر اسلم انصاری کے گھر پہنچ گئے۔ دروازے پر دستک دی۔ فرید نے کمبل میں چھپی کلائی باہر نکالی اور گھڑی میں ٹائم دیکھا۔

''یہ کسی شریف آدمی کے گھر آنے کا وقت نہیں ہے بابو جی!''

''مجھے پتہ ہے۔ مگر یہ ناصر کاظمی کا حکم ہے۔'' میں نے کہا۔ دروازے پر ایک بار پھر دستک دی۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا۔ ایک صاحب باہر نکلے۔ میں نے بے وقت تکلیف کے لئے معذرت کی۔ آنے کا مقصد بتایا۔ وہ نیند میں تھے۔ بات پوری طرح سمجھ نہیں رہے تھے۔ میں نے ایک کاغذ پر لکھ دیا کہ ''ناصر کاظمی آئے ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ابھی اور اسی وقت۔'' ان صاحب کو چٹ دی کہ اسلم انصاری کو دے دیں۔ وہ چٹ لے کر اندر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ صاحب باہر آئے اور کہنے لگے۔

''اسلم انصاری گھر میں موجود نہیں وہ لاہور گئے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''تو پھر آپ چٹ لے کر کس کے پاس گئے تھے؟''

انہوں نے کہا کہ گھر والوں سے پوچھنے گیا تھا کہ وہ کہاں گئے ہیں؟ میں اور فرید برستی بارش میں گھر پہنچے تو چوبارے میں کوئی نہ تھا۔ بتی جل رہی تھی۔ ناصر کاظمی اپنے سامان سمیت غائب تھے۔ میرے بستر کے سرہانے پر ان کے ہاتھ کی لکھی ایک چٹ رکھی ہوئی تھی۔ لکھا تھا۔

''تمہیں ناحق تکلیف دی۔ مجھے پتہ تھا کہ وہ نہیں آئے گا۔ میں لاہور جا رہا ہوں۔ لاہور آؤ تو مجھے ضرور ملنا۔''

تمہارا

ناصر کاظمی

میں نے سوچا میں خوش قسمت ہوں ناصر میرے پاس آئے۔ ناصر کاظمی کی خودغرضی انہیں میرے پاس لائی۔ مجھے اسلم انصاری کو بلانے بھیجا لیکن اسلم انصاری کیوں نہیں آیا (اس بات کا مجھے آج تک یقین ہے کہ وہ اس وقت گھر میں موجود تھا)۔

اسلم انصاری مجھ سے دو سال سینئر تھے۔ ناصر کاظمی اور اسلم انصاری کی دوستی چار سال تک مثالی دوستی رہی۔ ایک ساتھ اٹھنا بیٹھنا چلنا پھرنا گپ شپ۔ ناصر اس کے اشعار کی تعریف کرتے نہ تھکتے۔ دونوں پہروں بولتے اور چپ رہتے۔ لارنس باغ میں کسی باغ کے نیچے کھڑے ہو کر نیلے آسمان کو تکتے یوں لگتا تھا کیسے ورڈز ورتھ اور کولرج نام بدل کر دوبارہ دنیا میں آ گئے ہیں اور پھر اچانک ورڈز ورتھ اور کولرج ہی کی طرح دونوں الگ الگ راستوں پر گامزن ہو گئے کیوں؟۔ وجہ نہ ناصر کاظمی نے کبھی بتائی اور نہ ہی کسی نے آج تک اسلم انصاری سے پوچھی۔ بہر حال شدید بارش میں ناصر کاظمی سے میری ملتان میں یہ آخری ملاقات تھی۔

بی۔اے۔ کا امتحان پاس کیا تو میری ماں بہت؟ خوش ہوئی اور میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگی ۔بس اب تم کمیٹی میں نوکری کر لو۔ میں جلدی سے تمہاری شادی کر دوں گی۔ اب تمہارے بچوں کو

گود میں بیٹھا کر لوری دینے کو بہت جی چاہتا ہے۔

میرا ہاتھ ماں کے ہاتھ میں تھا چھڑانا بہت مشکل تھا۔ میں نے اپنا دوسرا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ کر کہا۔

''میں تیرا اکیلا بیٹا ہوں نا۔''

''ہاں''

''تو چاہتی ہے کہ مجھ جیسا کوئی اور نہ ہو۔''

''ہاں''

''تو پھر مجھے ایم اے کر لینے دے۔ شہر میں بی۔ اے تو سینکڑوں ہیں ایم اے کوئی نہیں۔''

میری ماں کے چہرے پر ایک رنگ سا لہرایا۔ آنکھوں میں ایک چمک سی آ گئی اور میرے ہاتھ پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میری ماں آہنی ارادے کی عورت تھی۔ دریا کے کنارے اُگے سرکنڈے کی طرح جسے دریا کی تیز موجیں جڑ سے اکھاڑنے میں ناکام رہتی ہیں۔ میری ماں نے ۱۹۴۷ء کا سارا خونچکاں ڈرامہ مجھے بغل میں چھپا کر دیکھا۔ خاوند کا جنازہ اٹھا تو خون کے آنسو پی کر رہ گئی۔ بلوائیوں اور وحشی سکھوں کے نرغے سے مجھے بچا کر پاکستان چلی آئی۔ یہاں آ کر اسے وہی سب کچھ کرنا پڑا جو آدم نے جنت سے نکل کر کیا۔

آسمان دور زمین سخت مگر وہ ننگے پاؤں کھدر کی چادر سے اپنا سفید سر ڈھانپے چانکیہ کی طرح زندگی کے جنگل سے دکھوں کے کانٹوں کی سرکش جھاڑیاں کاٹتی رہی لہو لہان ہوئی، بھوک پیاس سے لڑی مگر میرے لئے راستہ بناتی رہی، میں نے پہلی جماعت کا امتحان پاس کیا تو ایک روپے کی شکر لے کر محلے کے بچوں کو بانٹنے لگی۔ حکیم رشید نے وجہ پوچھی تو کہنے لگی۔

''میری بیٹے نے پہلی جماعت کا امتحان پاس کیا ہے۔''

حکیم رشید نے قہقہہ لگا کر کہا۔

''اچھا اچھا میں سمجھا ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا ہے۔

میں ماں کی انگلی تھامے پاس کھڑا تھا۔ حکیم رشید کی بات سانپ کی طرح کنڈلی مار کر میری ماں کے دل میں بیٹھ گئی۔ اس نے کہا

''اچھا حکیم جی اب یہ ایم۔اے کرے گا تو شکر لے کر آؤں گی''

میں نے اس کو حکیم رشید کی بات یاد دلائی کہ ابھی تو تم نے ایم۔اے کی شیرینی بانٹنی ہے بی۔اے کے بعد تو یہ ممکن نہیں ہوسکتا میری ماں نے یہ بات سن کر میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور اپنے سفید بال ماتھے سے پرے ہٹا کر کہنے لگی۔

''ٹھیک ہے کر لے ایم۔اے''

ماں کی بات سن کر اسی رات میں لاہور چلا آیا۔

لاہور پہنچا تو ٹی ہاؤس میں ناصر کاظمی سے ملاقات ہوئی۔ حسب معمول انگلیوں میں قینچی کی سگریٹ، ہونٹوں کے کونوں پر چھالیہ کا خشک چھلکا، چائے کے پیالی میں سگریٹ بجھا کر کہنے لگے۔

''کس مضمون میں داخلہ لے رہے ہو؟''

''اردو'' میں نے کہا۔

اردو کا نام سن کر ناصر کاظمی نے مخالفت میں ایک طویل تقریر کر ڈالی۔ میں نے مخالفت کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے۔

''اردو کے پروفیسروں کا علم مبلغ ڈھائی تولے ہے۔ غالب کے اشعار کی تشریح رجسٹروں میں چھپا کر لاتے ہیں۔ طالب علموں کے سامنے پڑھ کر چلے جاتے ہیں۔ ان سے پڑھو گے تو رہی سہی ذہانت بھی ہاتھ سے نکل جائے گی۔''

پل بھر کے لئے رکے اور پھر کہنے لگے۔

''اور پھر اردو ادب میں ہے ہی کیا؟ میر انیس اور غالب ان تینوں کو (Summer. Vacation) میں پڑھ لینا۔''

''لیکن پھر کروں کیا؟''

''تم انگریزی میں داخلہ لو گے۔ کیا کہنا اس ادب کا۔ شیکسپیر ملٹن شیلے بائرن زندگی کی تاریک راہیں روشن کر دیتے ہیں۔ انگریزی ادب کا مطالعہ کرو گے تو جھیل، جھرنے، موسم، بادل، پت جھڑ، بہار، ہوا، رنگ، خوشبو کی دنیا میں دن گزریں گے۔''

میں خاموشی سے یہ سب کچھ سنتا رہا۔

''تم کل صبح سویرے میرے پاس آ جاؤ میں ڈاکٹر نذیر کے پاس گورنمنٹ کالج لے چلوں گا۔ دو سو روپے ذہانت کا وظیفہ بھی ملے گا اور داخلہ بھی''۔ دوسرے دن دوستوں کا اصرار اور دو سو روپے ذہانت کا وظیفہ مجھے صبح صبح ناصر کاظمی کے گھر لے گیا 12 بجے سو کر اٹھنے والے ناصر کاظمی تیار تھے۔ یہ گھر والوں کے لئے حیرانی کی بات تھی۔ وہ مجھے ساتھ لے کر گورنمنٹ کالج کی طرف پیدل چل دیئے۔ سیکریٹریٹ کے گیٹ کے قریب سگریٹ سلگانے کے لئے رک گئے۔ ماچس کی تیلی پھینک کر کہنے لگے۔

''کل رات میں نے بہت غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ انگریزی ادب میں رکھا ہی کیا ہے۔ نہ میر کے غم کا لازوال تاثر، نہ انیس کی تصویر کشی، نہ مصحفی کا دھیما پن، نہ غالب کی شوخی اور ظرافت بقول عسکری صاحب میر کی شاعری جادو کی پڑیا ہے۔ انگریزی شاعری میں ہمارے ادب کا جادو کہاں''۔

میرے منہ سے نکلا۔

''مگر جھیل جھرنے بادل اور خوشبو۔''

میری بات کاٹ کر کہنے لگے۔

''یہ سب کچھ مثنویوں میں موجود ہے۔ کدم راؤ پدم راؤ۔ قطب مشتری پھول بن سحر البیان اور گلزار نسیم کی ورق گردانی کرو گے تو یہ سب کچھ مل جائے گا۔''

سگریٹ فٹ پاتھ پر پھینکا پاؤں سے مسلا اور فیصلہ صادر کیا۔

''تم ایم اے اردو میں داخلہ لو گے۔ انگریزی میں نہیں۔ یہ زبان تو پڑھانے والوں کو نہیں آتی تمھیں کیا پڑھائیں گے۔ اب پطرس بخاری اور سراج صاحب کہاں؟''

میں نے اثبات میں گردن جھکائی اور دوسرے دن ایم اے اردو میں داخلہ لے لیا۔

سجاد باقر رضوی اسلامیہ کالج سول لائنز کی نوکری چھوڑ کر انگریزی تنقید پڑھانے اورینٹل کالج آچکے تھے۔اورینٹل کالج ادب کا دربار اکبری بن چکا تھا۔ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر وحید قریشی، سید وقار عظیم، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر باقر، سید ناظر زیدی، سجاد باقر رضوی اور خواجہ ذکریا اس ادبی دربار کے نورتن تھے۔احمد حسن حامد گوہر نوشاہی، تبسم کاشمیری، صدیق جاوید، مسرور کیفی، عارف شاعر، سلیم بے تاب، انوار انجم، فیضان دانش اکرام چغتائی، فضل، ریاض مجید اور حبیب (گولڈن چپس والے) میرے قریبی دوستوں میں تھے اور خواجہ ذکریا دوست نما استاد۔ مجھے ایک دن دوستوں کے درمیان گھرا دیکھ کر سجاد باقر رضوی کہنے لگے۔

''لاہور کے گنبد بے در میں جتنی چاہے گرد اڑاؤ مگر ناصر کاظمی سے بچ کر رہنا۔اس کا ڈسا پانی نہیں مانگتا۔''

رضوی صاحب سب کو یہی کہتے ہیں۔ناصر کاظمی ہماری نئی نسل کا مقدر ہے۔اس سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ نہ ہم بچے ہیں اور نہ تم بچ سکتے ہو۔گوہر نوشاہی نے کہا ناصر کاظمی سے چند ملاقاتوں کے بعد پتہ چلا کہ گوہر نوشاہی ٹھیک ہی کہتا تھا۔میں نے باقر صاحب کو یقین دلایا کہ ناصر کاظمی سے ملنا گھاٹے کا سودا ہے۔کون اپنا وقت اور نیند برباد کرے۔ناصر کا دن تو رات ۱۲ بجے طلوع ہوتا ہے۔آخر ہم نے پڑھنا ہے۔امتحان پاس کرنا ہے۔ناصر کاظمی کے ساتھ چل پھر کے تو یہ سب کچھ ناممکن ہے۔باقر صاحب کو یقین آگیا اور وہ خوش تھے کہ عقیل روبی نے میری بات تو مانی لیکن حقیقت یوں نہ تھی۔میں باقر صاحب کو ان کے ریگل چوک والے گھر پہنچا کر سیدھا ٹی ہاؤس آتا اور ناصر کاظمی کو ڈھونڈتا۔

۱۹۶۲ء کا لاہور یونانیوں کی ریاست ایتھنز کی طرح Shopkeeper of Wisdom کہلاتا تھا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، عابد علی عابد، مولانا صلاح الدین احمد، احسان دانش، صوفی تبسم، مولوی محمد شفیع چلتی پھرتی علم کی اکیڈمی تھے۔ شہر میں چاروں طرف مختلف خالص ادبی تنظیمیں اجلاس برپا کرتی تھیں۔ ہمارے جیسے نوواردان بساط عشق کھلے کانوں بیٹھتے۔ اٹھتے تو جہالت کی کچھ نہ کچھ گرد جھاڑ کر۔ مال روڈ پر ابھی درخت ہرے تھے اور ڈیزل اور پٹرول نے ان کے فطری حسن کو داغدار نہیں کیا تھا۔ اس کی فٹ پاتھ مولوی صلاح الدین احمد کی ہوائی چپل سے مانوس تھی۔ کوئی نہ کوئی شاعر کوئی نہ کوئی دانشور کسی نہ کسی موڑ پر کسی دوست کے کاندھے پر ہاتھ رکھے محوِ گفتگو نظر آتا تھا۔ شہر سستا تھا۔ دو چار روپے جیب میں ڈال کر گھر سے نکلنے والا رات گئے بھرے پیٹ رکشے میں واپس لوٹ سکتا تھا۔ لارڈز (Lords) میں ایک روپیہ فی کس اور گارڈینیا میں ۷۵ پیسے فی کس وصول کیا جاتا تھا۔

نیلے گنبد کی نکڑ اور (Y.M.C.A) کی دائیں بغل میں بنا ٹی ہاؤس ادیبوں شاعروں اور دانشوروں کا مسکن تھا۔ آج کی طرح ٹی ہاؤس ۹ بجے بند ہونے کی قید سے آزاد تھا۔ مرحوم سراج کو گھر جانے کی جلدی نہ تھی اور ادیب و شاعر تو ویسے بھی گھر سے باہر عافیت محسوس کرتے ہیں۔ پاکستان بننے سے پہلے یہاں راجندر سنگھ بیدی۔ کرشن چندر، دیوندر ستیارتھی جیسے جگادری بیٹھتے تھے۔ حلقہ اربابِ ذوق کی ادبی تنظیم نے تقسیم کے بعد یہاں ادیبوں کو اکٹھا کیا اور ہفتہ وار اجلاس میں ادیب و شاعر مسلسل آنے لگے۔ میں نے لاہور میں اپنے قیام کے دوران احسان

دانش، فیض احمد فیض، عابد علی عابد، احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی سے لے کر ناصر زیدی تک کے شعراء کو یہاں آتے جاتے دیکھا ہے۔

میرے جیسے نیا نیا ادبی ذوق رکھنے والے طالب علموں کے لئے یہ سب بڑے قابل احترام تھے۔ ان کو دیکھ کر بات نہ سوجھتی اور بات کرتے تو لفظ لفظ پر لڑکھڑاتے۔ اس سارے گروپ میں قریب بلا کر محبت سے نام اور حال پوچھنے والے دو نام بڑے اہم تھے۔ سید سجاد باقر رضوی اور ناصر کاظمی۔ نوجوانوں کے لئے یہ دونوں پسندیدہ شخصیات تھیں۔ میں بھی ان دونوں کا اسیر ہوا اور کبھی رہائی کی دعا نہ مانگی۔

سجاد باقر رضوی اور ناصر کاظمی دو مختلف شخصیتوں اور اداروں کا نام ہے۔ دونوں کا اسلوب مختلف، انداز فکر اور شعر مختلف ایک غالب پسند دوسرا میر کا دیوانہ۔ باقر صاحب زندگی میں ترتیب و تشکیل کے قائل تھے۔ ناصر کاظمی بے ترتیبی اور الجھاؤ پسند۔ باقر صاحب محفل میں بیٹھ کر خوش، ناصر کاظمی تنہا رہ کر زیادہ پرسکون۔ دونوں کی دوستی پر لوگ ناز کرتے تھے اور دونوں اپنے چاہنے والوں پر مختلف صورت میں اثر انداز ہوتے تھے۔ باقر صاحب مجھے عقیل روبی صاحب اور ناصر کاظمی عقیل روبی کہہ کر پکارتے تھے۔

سجاد باقر رضوی اور ناصر کاظمی نے نئی نسل کو بڑا متاثر کیا۔ طالب علم باقر صاحب کے علم اور ذہانت سے پکڑ میں آتے تھے۔ ناصر کاظمی نے اپنی شخصیت کے سحر گفتگو اور انداز شعر سے گرفت میں لیا۔ نوجوان نسل کا ہجوم ان دونوں کے گرد منڈلاتا تھا مگر دونوں میں ایک فرق تھا۔ سجاد باقر رضوی کا خیال تھا کہ ناصر کاظمی کا ڈسا پانی نہیں مانگتا۔ ناصر کاظمی گفتگو کا ایک ایسا جال بچھاتا ہے کہ کچی عمر کے نوجوان کہیں کے نہیں رہتے۔ اس لئے وہ اکثر کہا کرتے تھے۔

''ناصر کاظمی کے گرد گھوم پھر کر اپنا وقت ضائع نہ کرو۔''

لیکن ناصر کاظمی نے کبھی یہ نہیں کہا کہ سجاد باقر رضوی کے پاس نہ بیٹھو بلکہ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ ''کچھ سیکھنا ہے تو پروفیسر سجاد باقر رضوی کے پاس بیٹھو اگر کچھ ضائع کرنا ہے تو میں حاضر ہوں''۔ لیکن ایسا بالکل نہ تھا۔ ناصر کاظمی نے ایسے ایسے در کھولے جہاں روشنی ہی روشنی تھی۔

میں نے باقر صاحب کا خاکہ لکھتے ہوئے پہلے بھی لکھا ہے کہ سجاد باقر رضوی شدھ اور خالص علم کے بیوپاری تھے۔ میں نے ان کی دکان سے بڑا اُدھار کھایا۔ اپنی سمجھ کے مطابق جتنا سودا سلف ہو سکا یادداشت کی پڑیوں میں لپیٹا۔ لیکن ان اجزاء کو مرکب بنا کر پیش کرنے کا نسخہ ناصر کاظمی سے سیکھا۔ ناصر کاظمی وہ شرارتی اور چالاک بچہ تھا۔ جو علم کے کھوٹے سکے کو انگوٹھے اور انگلی کی رگڑ دے کر یوں دوستوں کی محفل میں چلاتا تھا کہ اصلی سکے لوگوں کے ہاتھوں میں پڑے ناصر کاظمی کا منہ دیکھتے رہ جاتے تھے۔

میں نے ہمیشہ سجاد باقر رضوی کو ناصر کاظمی کے سلسلے میں دھوکہ دیا۔ ہر شام ناصر سے ملاقات ہوتی لیکن سجاد باقر رضوی کو یہی کہا کہ کئی دن ہو گئے ناصر کاظمی نظر نہیں آئے۔ لیکن جب ایم اے (فائنل) کے امتحانات کے قریب یہ راز فاش ہو گیا تو سجاد باقر رضوی بگڑ کر کہنے لگے۔

''ٹھیک ہے فرسٹ کلاس نہ آئے تو راوی میں جا کر ڈوب مرنا۔''

کسی نے یہ خبر ناصر کاظمی کو دی تو کہنے لگے۔

''ایسی نوبت نہیں آئے گی۔ فرسٹ کلاس لے گا عقیل روبی۔''

''اگر نہ آئی۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے میں نے گر بتلائے ہیں اسے فرسٹ کلاس لینے کے۔ یہی گر اسلم انصاری اور انوار انجم کو بتلائے تھے۔ دونوں کو فرسٹ کلاس آئی۔''

''لیکن پھر بھی۔'' خبر دینے والے نے ضد کی۔

''میں سید ہوں عقیل روبی جہاں راوی میں چھلانگ لگائے گا ایسا منتر پڑھوں گا کہ دریا خشک ہو جائے گا۔''

سجاد باقر رضوی اور ناصر کاظمی میرے لئے دو آنکھیں تھیں جن سے میں نے دنیا کو دیکھا اور اب تک دیکھ رہا ہوں۔

ناصر کاظمی تقریباً ۸ بجے شب ٹی ہاؤس میں طلوع ہوتے تھے۔ انتظار حسین باقر صاحب اور احمد مشتاق کے ساتھ گپ شپ لگاتے اور وہاں سے جو وقت بچتا ہم انہیں گھیر لیتے۔ ٹی ہاؤس بند ہوتا تو وہ انتظار حسین کے ساتھ کسی اندھیری سڑک میں گم ہو جاتے اور کبھی کبھی انتظار نہ ہوتے تو یہ وقت ہمارے حصے میں آ جاتا۔ ہماری اکثر دعا یہ ہوتی تھی کہ کاش آج ناصر کو انتظار حسین نہ ملے۔ میرے ساتھ اکثر یہ ہوا کہ ٹی ہاؤس سے نکل کر ریگل کی طرف ناصر کے ساتھ روانہ ہوا۔ انہوں نے پوچھا۔ ''اور کیا حال ہیں''۔ اور یہ جملہ وہ ہر پندرہ منٹ کے بعد پوچھا کرتے تھے۔ چلتے رہتے اور آسمان کو گھورتے رہتے تھے۔ اور پھر کئی بار ایسا بھی ہوا کہ اچانک کسی موڑ پر آ کر کوٹ کی جیب سے ہاتھ باہر نکالا اور میری طرف بڑھایا اور کہا۔

''اچھا خدا حافظ۔''

اور خود تیز قدم اٹھا کر اندھیرے میں غائب۔

رات ہوتے ہی ناصر کاظمی گم سم ہو جاتے تھے اور ایسے حالات میں تنہائی کے علاوہ انہیں کوئی ہم سفر نہیں بھاتا تھا۔ کسی سے کیسے پیچھا چھڑانا ہے۔ اس فن میں وہ بہت ماہر تھے۔ ایک بار ٹی ہاؤس سے اٹھے مجھے ساتھ لیا اور اے۔جی آفس کی طرف چلنے لگے۔ مجھ سے ادھر ادھر کی چند باتیں کیں اور پھر اچانک ان کے چہرے پر ایک اجنبی سا چہرہ ابھر آیا مجھ سے کہنے لگے۔

''غضب ہو گیا۔''

میں نے پوچھا ''کیا ہوا؟''

''ماچس ٹی ہاؤس کی میز پر رہ گئی۔''

''تو کیا ہوا میں سامنے والی دکان سے لے آتا ہوں''

''میں یہاں کھڑا ہوں۔اس کے بغیر رات کیسے گزرے گی؟''

''میں جلدی سے دکان کی طرف لپکا۔ایک ماچس خریدی واپس پہنچا تو ناصر کاظمی غائب تھے۔میں دل ہی دل میں ہنسا۔اس لئے کہ جب وہ ماچس نہ ہونے کا گلہ کر رہے تھے تو ماچس ان کے ہاتھ میں تھی۔میں اس لئے ماچس لینے گیا تھا کہ دیکھوں ناصر بھائی کا گلا قدم کیا ہو گا۔دوسرے دن مجھے ملے کہنے لگے۔

''رات تم نے میرے ساتھ کیا کیا میں دو گھنٹے انتظار کرتا رہا کہاں غائب ہو گئے تھے؟''

ناصر کاظمی دوسروں کو چونکا کر اور حیران کر کے بہت لطف اندوز ہوتے تھے اور یہ کام وہ واقعہ کی بنت اور اپنے اسلوب بیان سے لیتے تھے۔ناممکن کو ممکن بنا کر پیش کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔سننے والا بعد میں جو بھی نتیجہ اخذ کرے کرتا رہے۔لیکن ناصر کاظمی کے سامنے وہ مکمل طور پر ان کی گرفت میں ہوتا تھا۔ایک بار رات کو بارہ بجے زمزمہ توپ کے پاس رک گئے۔خاموشی سے اسے دیکھتے رہے اور پھر ہماری طرف منہ کر کے کہنے لگے۔

''کل ٹھیک اس وقت وہ مجھے یہاں ملی تھی کالی چادر میں اس کا چہرہ چھپا ہوا تھا۔صرف ہاتھ نظر آ رہے تھے۔ہاتھوں کی انگلیاں پیپ سے اٹی ہوئی تھیں۔زخموں سے لتھڑا ہوا ہاتھ اس نے میری طرف بڑھایا اور ایک روپیہ مانگا۔اس کی آواز سن کر میں چونک گیا۔حیرانی دور ہوئی تو میں نے کہا۔ایک نہیں پانچ روپے دوں گا پہلے اپنا چہرہ دکھاؤ۔اس نے چادر ہٹا کر چہرہ دکھایا۔چہرے پر پھنسیوں کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں بنی ہوئی تھیں۔پھنسیوں سے بچھو چمٹے ہوئے تھے اور آنکھوں کی بجائے دو گڑھے میری طرف جھانک رہے تھے۔جانتے ہو وہ کون تھی؟''

ہمارے خشک گلوں سے آواز نہ نکلی صرف سر انکار میں ہلے۔

''وہ میری ماں تھی۔''ان کی ماں کو مرے عرصہ ہو گیا تھا۔

ایک بار ہم نے فیصلہ کیا کہ آج کھانا ناصر کاظمی سے کھائیں گے۔ ان کے دفتر پہنچے بہت خوش ہوئے۔ چائے منگوائی۔ ہم نے چائے پی کر مدعا بیان کیا۔ کہنے لگے۔

''یار! کمال ہے کل میرے پاس پیسے تھے کل کیوں نہیں آئے۔ خیر اللہ والی ہے آؤ کچھ کرتے ہیں۔''

مال روڈ پر بے مقصد گھومتے پھرتے انارکلی میں داخل ہوئے۔ کرنال بوٹ ہاؤس کے قریب پہنچے تو کہنے لگے ''وہ عورت جو سامنے کھڑی ہے اس سے کھانے کے پیسے مانگ لوں'' میں نے انوار انجم کی طرف اور انجم نے میری طرف دیکھا۔ ابھی ہم کوئی فیصلہ نہ کر پائے تھے کہ وہ عورت ہمارے قریب آ گئی۔ ناصر کاظمی اس کے سامنے رک گئے۔

''اسلام علیکم۔''

''وعلیکم اسلام''

''عقیل روبی اور انوار انجم بضد ہیں کہ میں انہیں کھانا کھلاؤں مگر میرے پاس پیسے نہیں۔''

وہ عورت مسکرائی اور بیس روپے پرس میں سے نکال کر دے دئے اور چلی گئی۔ ہم حیران پریشان ناصر کاظمی کا منہ دیکھتے رہے کچھ نہ بولے نہ انہوں نے کوئی بات کی۔ ٹی ہاؤس میں واپس آ کر ہمیں کھانا کھلایا ہمیں چپ چاپ دیکھ کر کہنے لگے۔

''چپ کیوں ہو کوئی بات کرو۔ کیا سوچ رہے ہو؟''

میں نے جواب دیا۔ '' کچھ نہیں آپ کی ہمت کی داد دے رہے ہیں۔ راہ چلتی خاتون سے بیس روپے مانگ لئے۔''

ناصر کاظمی مسکرائے اور کہنے لگے۔

''اس میں ہمت کی کیا بات ہے وہ تو میری بیوی تھی''۔

ایک دن ناصر کاظمی باغ میں گھاس کی سبز چادر پر براجمان تھے۔ ان کے سامنے میں اور کچھ دوست ٹکٹکی باندھے انہیں دیکھ رہے تھے۔ باتوں کا رس کانوں میں اتر رہا تھا۔ گفتگو

ہندوستان کے پرانے مندروں اور طویل العمر پروہتوں کاہنوں اور نجومیوں کی ہو رہی تھی۔ ناصر کاظمی کہہ رہے تھے:۔

''میں نے ایک ایسے پروہت کو دیکھا ہے جو علم نجوم کا ماہر تھا اور جس کی عمر ۱۵۰ سال سے زیادہ تھی۔ دانت دوبارہ نکل آئے تھے اور سفید بالوں کے بعد دوبارہ سیاہ بال اگ آئے تھے۔ وہ ایک مندر میں رہتا تھا مندر شفاف جھیل کے درمیان یوں رکھا ہوا تھا جیسے دودھ کے پیالے میں کسی نے سرخ انڈا رکھ دیا ہوں۔ سنگِ سرخ پر جب چاندی کی کرنیں پڑتیں تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے سرخ جسم پر کسی نے سونے کی لکیریں کھینچ دی ہوں۔ ہم خچروں پر گئے تھے۔ جھیل کنارے خچر رک گئے کنارے اور مندر کے درمیان پتھر کی سیڑھیاں تھیں جن پر سبز کائی جمی ہوئی تھی جس پر کالے دھبے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا۔''

ناصر کاظمی رک گئے۔ ''ایسا معلوم ہوتا تھا۔''

ناصر پھر رکے۔ سگریٹ کا ایک طویل کش لیا دور خلاؤں میں گھور کر دیکھا۔ ''ایسا معلوم ہوتا تھا۔''

ہمارا اشتیاق اور ضبط تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ ناصر نے سگریٹ دور پھینکی اور لمبی سانس لے کر فقرہ مکمل کیا۔

''ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وقت ابھی ابھی یہاں سے پاؤں دھر کر گزرا ہے۔''

ہمارے اعصاب کا تناؤ ختم ہوا تو ناصر نے بات آگے بڑھائی۔

''ہم مندر میں داخل ہوئے بڑے بڑے ستون قدآور جنوں کی طرح اکڑے کھڑے تھے سونے چاندی کے فانوس کی چمک دمک میں ہم سب گورے اور سنہری نظر آرہے تھے۔ مندر کے آخری کونے میں روشنی کا ایک ہالہ سا نظر آیا۔ ہمارے قدم اس کی طرف بڑھنے لگے۔ اس ہالے کے درمیان آبنوس کی چوکی جس پر چاندی اور سونے کی کیلیں لگی ہوئی تھیں وہ پروہت بیٹھا تھا۔ یوگا کا آسن بنائے۔ آلتی پالتی مارے۔ اس کے سر کے بال سیاہ تھے۔ مگر پلکیں بالکل سفید اور اتنی لمبی کہ ٹھوڑی تک لٹکی ہوئی تھیں۔''

حیرانی نے ایک بار پھر ہمارے دل و دماغ کو جکڑ لیا۔ میں نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر پوچھا۔

''تھوڑی تک؟ ناصر بھائی!''

''ہاں بھئی جب اس نے ہمارے آنے کا سبب پوچھا تو دونوں ہاتھوں سے پلکیں اٹھا کر یوں سر پر رکھیں جیسے کوئی برقعے کا نقاب چہرے سے پیچھے کی طرف پھینک دے اور جانتے ہو ان پلکوں کے پیچھے کیا تھا؟''

''کیا تھا؟'' ہم سب بیک وقت بولے۔

''دو چھوٹے چھوٹے گڑھے جن میں ایک ایک انچ کے دو سنہری سانپ پھن اٹھائے بیٹھے تھے۔''

ناصر کاظمی جھوٹ بہت صفائی سے بولتے تھے لیکن اس چیز کا احساس لوگوں کو اس وقت ہوتا تھا جب ناصر بات ختم کر کے چلے جاتے لیکن ان کے جھوٹ میں اتنی مقناطیسیت تھی کہ لوگ دوسرے دن پھر اپنے دامن پھیلائے ناصر کاظمی کے جھوٹ کی بھیک کے منتظر نظر آتے تھے اور اس جھوٹ کو جھٹلانے میں بے بس نظر آتے تھے۔ یہ ناصر کا کمال تھا اور کبھی ان کا جھوٹ پکڑا بھی گیا تو اس کا سہرا بھی انہی کے سر جاتا تھا۔

۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء کے درمیان راوی میں اتنا شدید سیلاب آیا کہ موہنی روڈ داتا صاحب کرشن نگر اور راج گڑھ اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ صوفی تبسم راج گڑھ میں رہتے تھے۔ ان کا گھر بھی پانی میں گھر گیا۔ چند دن نہ ٹی ہاؤس آسکے نہ ہی دوستوں سے ملاقات ہوئی۔ جن لوگوں کو پتہ چلا وہ ان کے گھر گئے اور خیریت دریافت کی۔ ناصر کاظمی کسی وجہ سے نہ جاسکے۔ سیلاب کا زور کم ہوا تو صوفی تبسم سے ملاقات ہوئی۔ صوفی صاحب بگڑے۔ ناصر کو برا بھلا کہا۔ شکایت کی کہ تم کیوں نہیں آئے؟ میرے پاس۔ ناصر کاظمی نے فوراً جواب دیا۔

''میں آیا تھا صوفی صاحب میرے ایک دوست جو فوج میں میجر ہیں مجھے جیپ پر ملنے آئے میں نے ان کی جیپ پر آٹا، دال، چینی آپ کے لئے دو ایک چیزیں اور رکھیں لیکن جب

کرشن نگر کے موڑ پر آئے تو پانی دیکھ کر گھوڑا اڑ گیا۔ تانگے والے نے گھوڑے کو بڑے چابک مارے مگر گھوڑے نے ایک قدم آگے نہ بڑھایا۔"

کہتے ہیں ناصر کاظمی کا جھوٹ پہلی بار پکڑا گیا۔ ندامت پہلی بار چہرے پر لہرائی مگر اس ندامت میں معصومیت کی مقدار جھوٹ سے کہیں زیادہ تھی۔

کیپٹن، میجر، افسر، زمیندار، ڈی سی، کمشنر، سی ایس پی افسر ناصر کاظمی کی کمزوری تھے۔ اپنے واقف افسروں کا ذکر بڑی شان سے کرتے تھے ۱۹۶۲ء میں سی ایس پی کا لفظ تو جیسے ان کے ہونٹوں پر جم سا گیا تھا۔ جب بھی ہمارے مستقبل کا ذکر کرتے تان سی ایس پی پر آکر ٹوٹتی۔

"بس یار نوکری ہے تو سی ایس پی افسر کی باقی سب فضول ہے۔ رعب دبدبہ، اقتدار، اختیار، کار، ٹھاٹ باٹھ۔ ایم اے کے بعد پروفیسر نہ لگنا سی ایس پی بننا۔ پروفیسری میں کیا رکھا ہے۔ ٹی ہاؤس میں دس دس بیٹھے ہوتے ہیں جوں تک نہیں رینگتی کسی کے کان پر لیکن ایک سی ایس پی افسر آجائے تو دیواریں ادب میں جھک جاتی ہیں"۔

بات یہ تھی کہ سی ایس پی افسران سے ناصر کاظمی کے مراسم حد درجہ تھے۔ الطاف گوہر، تجمل حسین، محبوب خزاں کا ذکر وہ بڑے پیار سے کرتے۔ وہ نوجوانوں کی نسل کو اسی روپ میں دیکھنا چاہتے تھے تاکہ شاندار مستقبل کا سرٹیفکیٹ ان کی جیب میں ہو لیکن کبھی کبھی وہ یہ نسخہ خود بخود بدل بھی دیتے تھے۔ انوار انجم مرحوم کو دن رات نصیحت کرتے رہتے کہ سی ایس ایس کر لو۔ اس نے ایم اے کر لیا اور فوراً مظفر گڑھ نوکری بھی مل گئی۔ ناصر کاظمی کو پتہ چلا تو فوراً کہنے لگے۔

"فوراً (Join) کرلو۔"

"مگر میں تو سی ایس ایس کی تیاری کر رہا ہوں۔" انوار انجم نے کہا۔

"لاحول ولاقوۃ۔ یہ بھی کوئی نوکری ہے۔ ان سی ایس پی افسران نے تو معاشرے کو خراب کیا ہے۔ پروفیسر کا مقام ایک تقدس کا حامل ہے۔ کرار حسین نے سی ایس پی کیا ہے۔ ڈاکٹر نذیر اشفاق احمد خاں حمید احمد خان کون سے مقابلے کے امتحان میں بیٹھے ہیں۔ فوراً جاؤ مظفر گڑھ

جا کر رپورٹ کرواور وہاں جا کر خط لکھنا۔''
نوجوان شاعروں اور طالب علموں سے قرب کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ناصر کاظمی اپنے
اندر نوجوان طالب علم کوتا مرگ زندہ رکھنا چاہتے تھے۔شاید یہی وجہ تھی کہ وہ سپین میں گٹار بجانے
والے لڑکے کو بھی اپنا ہمعصر تصور کرتے تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ تم لوگوں میں بیٹھ کر مجھے
توانائی ملتی ہے۔ جرمن شاعر گوئٹے اور شیلر کا واقعہ اکثر دہرایا کرتے تھے اور اس خط کا حوالہ ضرور
دیتے تھے جس میں بوڑھے گوئٹے نے نوجوان شیلر کو لکھا تھا کہ مجھے ملتے رہا کرو۔تم آجاتے ہو تو
میرا لڑکپن لوٹ آتا ہے ایک دفعہ کہنے لگے۔

''یار تم سب لوگ میرے لئے ورڈز ورتھ کی Cukoo ہو تم لوگوں کی آواز سن کر تم
لوگوں کی پرواز دیکھ کر میں اپنے اس زمانے کی طرف پلٹ جاتا ہوں۔ جب میں گورنمنٹ کالج
کے نیو ہاسٹل میں بے فکری کی زندگی بسر کرتا تھا''۔

اور پھر اپنے کالج اور ہاسٹل کے زمانے کی باتیں بہت مزہ لے لے کر سناتے تھے۔
پطرس، ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر، صوفی تبسم کے دلچسپ فقرے، اپنی ذہانت کی باتیں، اپنے ٹھاٹ
باٹ اور شاندار زندگی کی حکایتیں۔ ہمارے ساتھ نہ صرف ذہانت میں مقابلہ کرتے بلکہ ہماری
بے وقوفیوں اور حماقتوں کی داستان سن کر ہم سے آگے رہنا چاہتے تھے۔ مثلاً اگر کسی نے کہہ دیا
کہ۔

''ناصر بھائی میرے ۶۰ لیکچرز شارٹ ہو گئے ہیں''

تو جواب ملتا۔''ہمارے ہزاروں لیکچرز شارٹ ہو جاتے تھے ہم نے تو پرواہ نہیں
کی۔''

اگر کسی نے کہہ دیا کہ ناصر بھائی میں ایک پرچے میں فیل ہو گیا ہوں۔ جواب دیتے۔
''تو کیا ہوا ہم چھ چھ پرچوں میں فیل ہو جاتے تھے کبھی فکر نہیں کی۔''
ایک دن میں لائبریری سے اٹھ کر ٹی ہاؤس پہنچا۔ میرے ہاتھ میں فائل دیکھ کر کہنے
لگے۔

''یہ کیا ہے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''کلاس نوٹس ہیں۔''

کہنے لگے۔ ''یہ حماقت کیوں؟''

میں نے جواب دیا۔ ''امتحان کی تیاری''

''مگر ارسطو نے تو کلاس نوٹس کو احمقانہ فعل قرار دیا ہے۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ میں نے کبھی نوٹس تیار نہیں کیئے اور ہمیشہ امتحان میں امتیازی حیثیت حاصل کی۔''

میں نے ناصر کاظمی کی بات پر عمل کیا اور وقار عظیم کے پرچے میں فیل ہو گیا۔ ناصر کاظمی کو پتہ چلا تو مجھے کہنے لگے۔

''کیا ہوا؟''

میں نے جواب دیا۔ ''افسانے کے پرچے میں ۱۵ نمبر آئے ہیں۔''

کہنے لگے۔ ''وقار عظیم کے لیکچرز کے نوٹس بنایا کرو بغیر نوٹس بنائے بھلا کہیں امتحان پاس ہوتے ہیں؟''

ناصر کاظمی با قاعدہ نقاد تو نہیں تھے اور نہ ہی کبھی انہوں نے اس طرف با قاعدہ توجہ دی لیکن دوستوں میں بیٹھ کر فرانسیسی مصنف والٹیر کی طرح ایسے تیکھے اور جاندار تنقیدی جملے کہہ جاتے تھے جو جنگل کی آگ کی طرح ادبی حلقوں میں پھیل جاتے تھے۔ فراق گورکھپوری کے وہ بہت مداح تھے۔ شعر اور شخصیت دونوں حوالوں سے ان کے گرویدہ۔ فراق صاحب طویل غزلیں کہنے کے عادی تھے اور غزل میں اکثر بودا اور کمزور شعر بھی کہہ جاتے تھے۔ فراق صاحب کے اس پہلو پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہنے لگے۔

"یہ بات درست ہے غزل میں کبھی کبھی فراق صاحب کے ہاں ایسا شعر آجاتا ہے جسے پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے کسی نوخیز دوشیزہ کی مونچھیں نکل آئی ہوں۔"

میر کے مقابلے میں ناصر غالب کے اتنے گرویدہ نہ تھے۔ لیکن غالب کی عظمت شعری، اسلوب، زبان پر ان کی حاکمیت اور قادر الکلامی کے بری طرح معتقد تھے۔ اور کہا کرتے تھے

"میں غالب کا اس لئے بھی معتقد ہوں کہ وہ میر کا معتقد ہے۔"

ایک دن غالب کی زبان اور لفظی حسن پر بحث ہو رہی تھی۔ کچھ لوگ اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ ناصر کاظمی سے پوچھا تو کہنے لگے۔

"غالب لفظوں کے شجرہ نسب سے کلی طور پر واقف تھا۔ اسے پتہ تھا کہ کون سا لفظ خاندانی اور کس کے خون میں ملاوٹ ہے۔ غالب لفظوں کو حکم دیتا تھا کہ قطار بنا کر کھڑے ہو

جاؤ۔ لفظوں کے چہرے دیکھ کر خاندانی لفظوں کو آگے آنے کا حکم دیتا اور بداصل لفظوں کو چلے جانے کا اور پھر شعر میں لفظوں کا استعمال کرتا تھا۔ وہ لفظوں کے شجرہ نسب سے واقف نہ ہوتا تو یہ شعر کیسے کہتا۔

لکھتا ہوں اسد سوزش دل سے سخن گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پہ انگشت

غالب اور اس کے نقادوں کے بارے میں ایک بار بڑی گرم جوشی سے کہا۔

''غالب نقادوں کی گرفت میں نہیں آ سکتا۔''

کسی نے پوچھا ''کیوں''

''تمہیں پرانے زمانے کے چوروں کے بارے میں کچھ علم ہے؟''

''نہیں۔''

''وہ جب گھر سے چوری کرنے نکلتے تھے تو جسم پر تیل مل کر اور لنگوٹا پہن کر نکلتے تھے۔''

''کیوں؟''

''تاکہ اگر کوئی انہیں پکڑنے کی کوشش کرے تو ہاتھ جسم پر نہ ٹھہرے اور پھسل جائے۔''

''مگر غالب کا اس چور سے کیا تعلق؟''

''غالب ایک ایسا شاعر ہے جو نقادوں کے اکھاڑے میں جسم پر تیل مل کر اور لنگوٹا پہن کر کھڑا ہے۔ جب کوئی نقاد اسے گرفت میں لینے کی کوشش کرتا ہے غالب کا جسم ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔''

ناصر کاظمی پڑھے لکھے شاعر تھے۔ ہندو اور یونانی دیو مالائی داستانیں انہیں ازبر تھیں۔ کالی داس، میرا بائی کا گہرا مطالعہ تھا۔ انگریزی فرانسیسی اور جدید شعراء کے کلام پر نظر رکھتے تھے لیکن انہیں عالمی ادب کی چیدہ چیدہ خصوصیات کو اپنے اسلوب کے

کپڑے پہنا کر پیش کرنے کا فن آتا تھا۔ میر ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ بہتر نشتروں کے علاوہ ہر روز میر کے دیوان سے کوئی نیا نشتر ڈھونڈنا ان کا مشغلہ تھا اور اس نشتر کی دوسروں تک ترسیل کو وہ عبادت سمجھتے تھے۔ میر کی شاعری کے فنی محاسن اور شعری حسن پر گفتگو ان کی عادت تھی بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ انہوں نے میر کو اپنے دل کی حویلی کا سب سے اچھا کمرہ بغیر کرائے کے دے رکھا تھا اور میر شاید اس کمرے میں اس شرط پر رہائش پذیر تھے کہ ہر وقت میرا ذکر کیا کرو۔ میر کی شاعری کا ناصر نے بے حد اثر قبول کیا۔ میر کی اداسی اور غم ناصر کی شاعری میں سمٹ آیا لیکن ناصر میر کی چھتنار شخصیت میں گم نہیں ہوئے۔ زندہ آواز بن کر چہکتے رہے اور یہ آواز کانوں کو بھلی لگتی تھی اور اس آواز کی ایک پہچان تھی۔

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اداسی بال کھولے سو رہی ہے

یاد کے بے نشاں جزیروں سے
تری آواز آ رہی ہے ابھی

دھیان کی سیڑھیوں پر پچھلے پہر
کوئی چپکے سے پاؤں دھرتا ہے

ناصر کاظمی کو شکار سے بڑی دلچسپی تھی وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ میں نے بارہ سال کی عمر میں شیر مارا تو پورے گاؤں نے جشن منایا لیکن ہم نے انہیں کبھی مچھر مارتے ہوئے بھی نہیں

دیکھا لیکن کئی جنوط شدہ شیر اور ہرن ان کی یاداشت کے دالان میں سجے ہوئے تھے۔شیروں کی اقسام، رنگ، نفسیات، فطرت۔ان میں انسانی عادات کی تلاش ان کی گفتگو کا اثر دوبالا کر دیتی تھی۔ایک دن کہنے لگے۔

''شیر ظلم ہی نہیں کرتا عشق بھی کرتا ہے۔''

''کس سے؟''

کہنے لگے۔''بکری سے۔''

ہم نے کہا''شیر اور بکری کے ایک گھاٹ پانی پینے کا ذکر پڑھا ہے لیکن عشق کا ذکر نہ سنا نہ پڑھا۔

ناصر اس شام تو خاموش رہے لیکن دوسرے دن''تزک جہانگیری'' اٹھا لائے جس میں الہ آباد کے ایک چڑیا گھر کی تفصیل درج تھی۔جس میں ایک شیر اور بکری کے عشق کا تذکرہ تھا۔دونوں ایک پنجرے میں رہتے تھے۔شیر بکری کو خوش رکھنے کے لئے گھاس کھاتا تھا اور بکری شیر کا دل رکھنے کے لئے کبھی کبھی گوشت بھی کھالیتی تھی۔ایک بار ہرن کے شکار کا ذکر کر رہے تھے۔ہم میں سے کسی نے کہا۔

''ناصر بھائی ہرن تو بڑا معصوم جانور ہے آپ کو اسے شکار کرتے ہوئے رحم نہیں آیا۔''

''آیا تھا۔'' ناصر کاظمی نے کہا''لیکن مجبوری یہ تھی کہ میں اسے شکار نہ کرتا تو اسے شیر کھا جاتا۔''

شیر اور ہرن کے شکار کا شوق تو ان کے بچپن سے متعلق تھا۔ہمارے سامنے نہ کبھی انہوں نے شیر مارا اور نہ ہرن مگر ایک شوق انہوں نے تا مرگ نبھایا اور وہ پرندوں سے محبت کا شوق تھا کبوتروں سے ناصر کی دلچسپی انتہائی درجہ تک پہنچی ہوئی تھی صبح سویرے اٹھ کر انہیں دانہ پانی دکھانا، کابک سے نکال کر ہوا میں اڑانا ہر کبوتر کے پروں کی دیکھ بھال ناخنوں کی نگہداشت کرنا دن نکلنے پر ان کا پہلا کام تھا۔کہا کرتے تھے۔

''کبوتر باز کی نہ کبھی بینائی کمزور ہوتی ہے نہ پھیپھڑوں کا کوئی مرض لاحق ہوتا ہے۔

کبوتر اڑا کر اسے آسمان کی بلندیوں میں تلاش کرنا بینائی کے لئے مفید ثابت ہوتا ہے اور جب کبوتروں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ میں کبوتر باز سانس کھینچتا ہے تو پھیپھڑوں کو ایک نئی زندگی ملتی ہے''۔

اصلی اور خاندانی کبوتر کی تلاش میں ناصر مارے مارے پھرتے تھے۔ کسی نئے شہر میں مشاعرے پر جائیں اور انہیں پتہ چل جائے کہ یہاں نایاب کبوتروں کی منڈی ہے تو بھاگم بھاگ وہاں پہنچتے اور کچھ نہ کچھ خرید لیتے۔ ایک بار مجھے کہنے لگے۔

''ملتان جانا ہے''

''کیوں۔ اسلم انصاری سے ملنا ہے'' میں نے کہا۔

''نہیں وہ دکان بند ہوگئی ہے دراصل پتہ چلا ہے کہ کچھ کبوتر روس سے اڑ کر پاکستان کی طرف آئے ہیں اور ایک جتھہ ملتان کی طرف گیا ہے سوچتا ہوں ملتان ہو آؤں۔ انور انجم کے ہاں ٹھہروں گا راجہ فاروق حسن بھی وہاں ہے اور سنا ہے صدیق جاوید بھی اس کے پاس ہے تم بھی چلو''

میں نے معذرت کی اور ناصر کبوتر لینے ملتان چلے گئے۔ جس دکان کے بند ہونے کا ناصر نے اعلان کیا تھا وہ دکان بند نہیں ہوئی تھی۔ اسلم انساری سے ملنا بھی کبوتروں کی خریداری میں شامل تھا لیکن صدیق جاوید کی زبانی یہ پتہ چلا کہ ناصر کا یہ دورہ ناکام رہا۔ چار پانچ دن انور انجم کے ہاں قیام کیا۔ خوب کھایا خوب جاگے شاعری کی لیکن نہ روس کا کبوتر ملا نہ اسلم انصاری۔

اسلم انصاری اور ناصر کاظمی کے تعلقات ان دنوں معمہ بنے ہوئے تھے اسلم انصاری اچھے شعر اور خوبصورت ترنم اور تہہ دار شخصیت لے کر لاہور آیا۔ ملتان کا رہنے والا تھا لیکن کبھی ملتانی یا پنجابی زبان میں گفتگو نہ کی۔ باقر صاحب الہ آباد کا تصور کرتے تھے اور طویل عرصے تک اسی غلط فہمی میں مبتلا رہے۔ ناصر کے ساتھ دوستی کی وجہ شاید ایک یہ بھی تھی۔ ناصر اور اسلم انصاری کا پہروں ساتھ رہا لیکن صرف ایم۔ اے تک۔ جونہی ایم اے کیا تعلقات کی ڈوری کٹ گئی۔ ناصر اسلم کے جتنے قریب تھے اسلم ناصر سے اتنا ہی دور ہو گئے اسلم انصاری ملتان چلا گیا۔ اس

کے جانے کے بعد ناصر کاظمی اکثر یہ شعر گنگنا کر اداس ہو جایا کرتے تھے۔

نئے کپڑے بدل کر جاؤں کہاں اور بال بناؤں کس کے لئے

وہ شخص تو شہر ہی چھوڑ گیا میں باہر جاؤں کس کے لئے

ویسے بقول خواجہ زکریا کہتے ہیں کہ ناصر کاظمی کی بارہ تیرہ غزلیں ایسی ہیں جن کا پس منظر سوائے ناصر کاظمی اور اسلم انصاری کے تیسرا کوئی آدمی نہیں جانتا۔ امتحان سر پر آ گیا۔ میں تیاری میں بری طرح مصروف تھا۔ ایک دن میں یونیورسٹی لائبریری سے نکل کر کیفے ٹیریا جانے کے لئے یونیورسٹی ڈپو کے قریب سے گزارا۔ دیکھا کہ ناصر کاظمی ایم اے کی ڈیٹ شیٹ نوٹ کر رہے ہیں۔ میں قریب پہنچا تو کاغذ جیب میں رکھ لیا۔ میں نے پوچھا۔

''آپ کیا کر رہے ہیں؟''

''یونہی دیکھ رہا تھا کہ تم لوگوں کا کون سا پرچہ کس دن ہے''۔ پھر کہنے لگے۔

''آج سے تمہارا ٹی ہاؤس آنا بند محنت کرو پڑھو اور امتحان میں فرسٹ کلاس حاصل کرو تب ہی کچھ بات بنے گی ورنہ نوکری ووکری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا''

اور پھر ایسا ہوا کہ جب تک میرے امتحان ہوتے رہے وہ صرف ہوسٹل یہ پتہ کرنے آتے تھے کہ پرچہ کیسا ہوا ہے۔ آگے پیچھے دیکھ کر آنکھ بچا جاتے تھے۔ آخری پرچہ دے کر میں وولنر ہال سے نکلا تو دیکھا سامنے سے ناصر کاظمی اور امانت علی خان چلے آ رہے ہیں میں جلدی جلدی قدم اٹھا کر ان کے قریب گیا۔

''کیسا پرچہ ہوا؟''

''بہت اچھا۔''

میرے ہاتھ سے پرچہ لے کر کہنے لگے۔

''کس پر لکھا مضمون؟''

''فسانہ آزاد''

میں کچھ مزید کہنے والا تھا کہ امانت علی خان ناصر سے کہنے لگے۔

''مطلب کی بات بھی کرو۔''

ناصر نے امانت سے کہا۔

''وہ بھی ہو جاتی ہے دیکھ تو لوں امتحان میں کیا کر کے آیا ہے۔''

پھر پرچہ میرے ہاتھ میں پکڑا کر کہنے لگے۔

''ٹھیک ہے۔ تمہاری جیب میں کتنے روپے ہیں؟''

میں اس سوال سے اچانک گھبرا گیا کیونکہ صرف ۳۰ روپے تھے۔

میں نے کہا

''تیس روپے'' اور نوٹ ہتھیلی پر رکھ کر ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

''یہی ہیں۔''

ناصر کاظمی نے دس دس کے دو نوٹ اٹھائے امانت علی خان کا ہاتھ پکڑا اور لا ء کالج کے گیٹ کے باہر چلے گئے۔

میرے امتحان کا نتیجہ آیا تو باقر صاحب اور ناصر کاظمی کو بہت خوشی ہوئی۔ باقر صاحب کو زیادہ کیونکہ انہوں نے مجھ سے ناامید ہو کر یہاں تک کہہ دیا تھا کہ۔

''فرسٹ کلاس نہ آئے تو راوی میں کود جانا مجھ سے نہ ملنا۔''

''خیر نتیجہ سن کر میں گھر والوں کو تسلی دینے کے لئے خانیوال چلا گیا۔ دوسرے دن مجھے ناصر کاظمی کی ٹیلی گرام ملی کہ نوکری کا انتظام ہو گیا ہے فوراً چلے آؤ۔ میں نے دائیں بائیں سے تین سو روپے پکڑے اور لاہور آ گیا۔ ٹی ہاؤس میں ارشاد راؤ، تبسم کاشمیری نے نوکری کی مبارک دی۔ میں نے کہا مگر کہاں۔ جواب دیا کہ ''ناصر کاظمی نے'' بقول ان کے ''ایک شاندار نوکری تمہارے لئے ڈھونڈی ہے اور وہ دو دن سے تمہارے منتظر ہیں۔'' میں ان سے رخصت ہو کر ریڈیو سٹیشن پہنچا تو ناصر کاظمی اپنے کمرے میں کچھ لکھنے میں مصروف تھے۔ باہر برآمدے میں صوفی تبسم صاحب سے ملاقات ہوئی کہنے لگے۔

''جاؤ دو دن سے تمہاری نوکری کا ڈھنڈورا پیٹ رہا ہے۔ لاکھ پوچھا کہ کہاں کیا ہے

نوکری کا بندوبست بتلاتا ہی نہیں۔تم خود پوچھ لو۔"

میں اندر گیا ناصر نے مجھے دیکھا ہاتھ ملایا حال پوچھا اور چند لمحوں کی اجازت لے کر لکھنے میں مصروف ہو گئے۔دو گھنٹے کے بعد پوچھا۔

"کچھ کھاؤ گے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔گھنٹی بجا کر چپڑاسی کو بلا کر ٹوسٹ اور کباب کا آرڈر دیا۔ کھانے کے عمل میں کچھ وقت لگا میں منتظر تھا کہ جس بات کا صوفی تبسم سے لے کر گوہر نوشاہی تک کو علم ہے مجھے بھی پتہ چل جائے تو کتنا اچھا ہو لیکن بات نہ ناصر نے بتلائی اور نہ ہی میں نے پوچھی۔۴ بجے ناصر اٹھے مجھے ساتھ لیا پیدل مولا بخش پان والے کی دکان پر آ گئے۔سگریٹ خریدے پان لئے اور پھر چل دیئے۔چلتے چلتے دیوسماج روڈ پر آ گئے غالباً یہاں وہ دفتر تھا جہاں ناصر کاظمی محکمہ زراعت میں ملازمت کرتے تھے۔چلتے چلتے کہنے لگے۔

"زبان کا مسئلہ شاعری میں بڑی اہمیت کا حامل ہے"۔

"جی وہ تو ہے"

"کیٹس لفظوں کی کاری گری کا قائل ہے۔اچھا شعر وہی ہے جس میں لفظ موتیوں کی طرح جڑے ہوئے ہوں لفظوں کا Arrangement ہی اصل شاعری ہے۔لفظوں کو ترتیب سے مرتب کرنا بالکل ایسے ہے جیسے رمی کھیلنے والے شاطر کھلاڑی تاش کے پتے ترتیب دیتے ہیں۔"

ناصر نے چلتے چلتے دوسری سگریٹ سلگائی۔

"بات کچھ یوں بنی کہ اچھا شاعر تاش کا اچھا کھلاڑی بھی ہوتا ہے۔کیا خیال ہے تمہارا میں نے جواب دیا۔"ہاں بات کچھ دل کو لگتی ہے۔"

"تمہارے پاس کتنے پیسے ہیں؟"

میں نے جواب دیا" دوسو روپے"

"بات بن گئی لاؤ"

میں نے جیب سے نکال کر پیسے دے دیئے۔ ''آؤ۔'' ناصر بولے اور پھر ایک کوٹھی نما دفتر میں داخل ہو گئے۔ برآمدے میں جا کر دروازے پر دستک دی۔ چند لمحے بعد ایک آدمی نے کھڑکی کھولی ہمیں دیکھا مسکرایا اور دروازہ کھول دیا۔ اندر چاروں طرف دھواں ہی دھواں تھا۔ آٹھ دس آدمی قالین پر بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ ناصر کاظمی کو دیکھ کر تین چار آدمی بیک وقت بولے۔

''آ گئے شاہ جی آ گئے اب مزہ آئے گا''۔

ناصر کے لئے لوگوں نے جگہ بنائی۔ ناصر بیٹھ گئے اور مجھے بھی ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا اور تاش کھیلنے لگے لیکن پتے بانٹے جاتے تو وہ مجھ سے بھی چھپا کر رکھتے۔ پہلے پہل تو ناصر کاظمی ہارتے رہے لیکن پھر جیتنا شروع کر دیا لیکن اس دوران انہیں پیٹ درد کی شکایت شروع ہو گئی۔ ہر دس منٹ بعد باتھ روم جاتے اور ریڈیو پاکستان کی کنٹین کے کبابوں پر لعن طعن بھیجتے رہے۔ رات ۱۲ بجے تک تاش کی محفل جمی رہی۔ ہر کھیلنے والا ہارا انہوں نے ناصر سے پوچھا تو وہ بھی کوئی پیسہ نہ جیتے تھے۔ میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے۔

''میں تو اس کے بھی دو سو روپے ہار گیا۔''

باقی کھلاڑی حیران تھے کہ آخر روپے گئے کہاں انہیں زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ ان کو اس الجھن میں چھوڑ کر ناصر مجھے ساتھ لے کر تیز قدموں سے باہر آئے اور سڑک پر آ کر رفتار اور تیز کر دی اور پندرہ بیس منٹ رفتار کی تیزی میں کمی نہ آئی۔ آخر ایک دکان سے سگریٹ خریدے اور پھر چلنا شروع کر دیا۔ کہنے گے۔

''میں ہارا نہیں آٹھ سو روپے جیتا ہوں۔''

''مگر آپ تو وہاں کہہ رہے تھے ہارا ہوں۔''

''وہاں کے لئے یہ بیان ضروری تھا۔''

''مگر کیوں''

''وہاں ہر آدمی کا میں مقروض تھا۔''

جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹ نکالے

''یہ تمہارے دوسو اور ایک سو بونس۔''

''اس کی کیا ضرورت ہے؟''

''نہیں یہ ضروری ہے تم سے دوسو لئے تو یہ سوچ کر لئے تھے کہ جیتا تو سو روپیہ تمہاری نذر کروں گا۔''

میں نے پیسے پکڑ لئے چاند آسمان پر پوری طرح نکلا ہوا تھا۔ ناصر اس کی طرف منہ کر کے اپنا شعر گنگنا رہے تھے۔

چاند نکلا تو ہم نے وحشت میں
جس کو دیکھا اسی کو چوم لیا

میں ان کی بنگالی طرز گائیگی سے پوری طرح لطف اندوز نہ ہو سکا۔ گھر قریب آ گیا تھا۔ وقت کافی ہو چکا تھا مجھے جانے کی جلدی نہ تھی۔ نوکری، جگہ، تنخواہ جاننے کا اشتیاق تھا۔ گھر کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر ناصر نے دروازے پر دستک دی۔

''بہت دیر ہو گئی۔''

دستک پھر دی اور جب دروازہ کھلا تو میری طرف ہاتھ بڑھا کر کہنے لگے۔

''اچھا خدا حافظ صبح ملاقات ہو گی۔''

میں نے ہاتھ ملایا جب ناصر اندر جا کر دروازہ بند کرنے لگے تو میں نے کہا۔

''ناصر بھائی وہ نوکری۔''

''لاحول ولاقوۃ وہ کوئی نوکری تھی نرا سر درد تھا تمہارا ستیاناس ہو جاتا میں نے کشور ناہید کو وہاں لگوا دیا ہے تفصیلی بات صبح ہو گی۔''

یہ کہہ کر دروازہ بند کر لیا اور میں ہاسٹل واپس آ گیا۔

دوسرے دن میں ٹی ہاؤس پہنچا تو ہوش ترمذی اور ناصر کاظمی بیٹھے تھے مجھے دیکھ کر ناصر کاظمی کہنے لگے۔

''اچھا ہوا تم آ گئے تمہارا ہی ذکر ہو رہا تھا۔''

ہوش ترمذی کہنے لگے

''عقیل روبی اداس ہونے کی ضرورت نہیں یہ دیکھو کاغذ میں خرید لایا ہوں۔ درخواست لکھتے ہیں ناصر کہہ رہا ہے۔ ڈائریکٹر تعلیمات پروفیسر غلام مصطفیٰ شاہ سے بڑے تعلقات ہیں ابھی جا کر تمہیں نوکر کرا دے گا۔''

میں چپ رہا ہوش ترمذی نے درخواست لکھی۔ ناصر نے درخواست ان کے ہاتھ سے لی پڑھی اور کہنے لگے۔

''سبحان اللہ سید کے ہاتھ کا لکھا سید کو نوکری دینے پر مجبور کر دے گا۔'' مجھے ساتھ لیا اور سیدھے ڈائریکٹریٹ پہنچ گئے پروفیسر غلام مصطفیٰ ڈائریکٹر تعلیمات تھے۔ ناصر نے چپڑاسی سے شاہ صاحب کے بارے میں پوچھا اس نے کہا اندر ہیں۔

''انہیں جا کر کہو ناصر کاظمی ملنا چاہتے ہیں۔''

وہ اندر چلا گیا واپس آیا دروازہ کھول کر کہنے لگا۔

''تشریف لائیے۔''

میں اور ناصر اندر گئے۔ ناصر نے شاہ صاحب کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا۔

''ناصر کاظمی''

''میں جانتا ہوں آپ تشریف رکھئے''۔ مصطفیٰ شاہ نے کرسی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

ہم بیٹھ گئے مصطفیٰ شاہ ناصر سے کہنے لگے۔

''فرمائیے۔ کیسے زحمت کی۔''

''عقیل روبی نے اس سال ایم اے کیا ہے۔ بہت اچھے شعر کہتا ہے اسے فوراً نوکری دے دیجئے۔''

ناصر نے درخواست سامنے رکھ دی۔

''فوراً'' شاہ صاحب نے درخواست پر نظر ڈال کر کہا۔

''جی ہاں فوراً ورنہ ناصر کاظمی کے آنے کا مقصد فوت ہو جائے گا۔''

''آپ کا مقصد فوت نہیں ہوگا۔''

مصطفیٰ شاہ نے درخواست پر کچھ لکھا۔اور Bell دے کر اپنے سٹینوگرافر کو بلایا وہ آیا تو درخواست اسے دے کر کہا'' آرڈر ٹائپ کر کے فوراً لاؤ۔''

پھر ناصر کاظمی سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔

''میں معافی چاہتا ہوں ناصر صاحب انہیں میں لاہور میں نہیں رکھ سکا۔مظفر گڑھ جانا پڑے گا۔''

''یہ مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے یہاں آئے ہیں تین سو میل اور سہی'' اور اس طرح میں نوکر ہو گیا ناصر کاظمی مجھے سوار کرانے اسٹیشن آئے جب گاڑی چلنے لگی تو ناصر دوڑ کر ڈبے کی طرف آئے۔ایک سو روپیہ میری جیب میں ڈال کر کہنے لگے۔

''ایک ہی ہے سنبھل کے خرچ کرنا۔''

مظفر گڑھ میں میرا قیام صرف تین ماہ رہا کیونکہ یہ پوسٹ صرف تین ماہ کے لئے تھی میں واپس لاہور آ گیا یوسف جمال انصاری ان دنوں ڈپٹی سیکریٹری ایجوکیشن تھے سوچا باقر رضوی صاحب کے ان کے ساتھ تعلقات اچھے ہیں وہ ضرور کچھ کریں گے میں جب باقر صاحب سے ملا تو وہ مشاعرہ میں شرکت کے لئے کوئٹہ جا رہے تھے کہنے لگے۔

''یوسف جمال بھی ہمارے ساتھ کوئٹہ جا رہے ہیں میرے ساتھ اسٹیشن چلو وہاں بات کرتے ہیں'' اسٹیشن پر یوسف جمال نے ڈپٹی ڈائریکٹر شیخ عزیز کے نام رقعہ دے دیا اور کہا کہ جاؤ چھٹیوں کے بعد بہاول پور تمہاری تقرری ہو جائے گی۔ وہاں ناصر کاظمی بھی تھے وہ بھی کوئٹہ جا رہے تھے سجاد باقر رضوی لمبے سفر سے گھبرا رہے تھے ایک تو کوئٹے کا طویل سفر اور دوسرے ایئر کنڈیشن میں کوئی سیٹ نہیں مل رہی تھی وہ پریشانی میں ادھر ادھر گھوم رہے تھے ناصر کاظمی نے مجھ سے پوچھا۔

''نہیں کیا مسئلہ درپیش ہے۔''

''میں نے بتایا کہ ایئر کنڈیشن میں سیٹ کا انتظام کرنے کی فکر میں ہیں'' میں نے بات ختم کی تو باقر صاحب آ گئے اور ناصر سے کہنے لگے۔

''یار ناصر کاظمی مارے جائیں گے گرمی میں بڑا لمبا سفر ہے۔''

ناصر کاظمی کہنے لگے۔ ''چپکے سے جہاں جگہ ملی ہے بیٹھ جاؤ۔ حضرت امام حسین کربلا ایئر کنڈیشن کوچ بک کرا کے نہیں گئے تھے۔'' یہ بات سن کر باقر صاحب چپکے سے جہاں جگہ ملی بیٹھ گئے۔

ٹی ہاؤس میں مسلسل آنے والوں میں جہاں انتظار حسین ،ناصر کاظمی ، سجاد باقر رضوی ،انجم رومانی اور شہرت بخاری شامل تھے وہاں ایک صاحب اور بھی مسلسل آنے والوں میں شامل تھے اور وہ تھے نواب ناطق ۔ مغربی ملبوس سے آراستہ چھوٹا قد Planet of Apes کے دانشور جیسا گول چہرہ گول آنکھیں چہرے کی یہ خصوصیت کہ ہر پل تبدیل ہوتا تھا۔کبھی حیران کبھی پریشان کرسی پر ٹیک لگا کر بیٹھے ہیں اچانک سارا بدن کھسک کر میز کے نیچے اور صرف سر باہر۔نواب ناطق کو یہ شرف حاصل تھا کہ ٹی ہاؤس آنے والا ہر شاعر اور ادیب کبھی نہ کبھی ان کے ساتھ ضرور بیٹھتا تھا شعر کہتے تھے شعر میں معنی کی تلاش قاری پر چھوڑ دیتے اگر مطلب تلاش کر لے تو اس کی قسمت ۔ بے وزن بے معنی ۔مگر پھر بھی ہر شاعر کو ان کے تین چار شعر ضرور یاد تھے۔نواب ناطق کا نیا شعر پل بھر میں ٹی ہاؤس کی ہر میز پر سننے والوں میں بٹ جاتا تھا۔ایک بار خواجہ زکریا نے نواب ناطق کو کوئی نیا شعر سنانے کی فرمائش کی نواب ناطق کے چہرے پر سنجیدگی کی لہر دوڑ گئی منہ یوں چلایا جیسے جگالی کر رہے ہوں کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھے تھے اچانک تیزی سے آگے کی طرف گرے میز پر دونوں ہاتھ ٹیک کر شعر سنایا۔

ناطق کہ سخن تیرا ہے تریاق تری ہے
زنمباخ تری ہالقاز نمباخ تری ہے

خواجہ زکریا شعر سن کر چکرائے کہنے لگے۔

''ناطق صاحب پہلے مصرعے کا مطلب تو کسی نہ کسی طرح نکال ہی لیا جائے گا مگر یہ دوسرا مصرع سمجھ میں نہیں آیا۔''

نواب صاحب کہنے لگے ''اس کا مطلب تو مجھے بھی نہیں پتہ کسی نے کہا گرہ لگا دو میں نے لگا دی۔''

ان کے سارے شعر اسی قبیل کے تھے جن کا مطلب نہ خالق کے ذہن میں تھا نہ قاری کے ذہن میں۔

فضولیات زمانہ تیری طرح ہم بھی
جو آ سکے نہ خیالوں میں خام لائے ہیں

میں رند پرند اپنی جو پرواز کا ہُوا
ساقی یہ میکدہ مجھے کہتا ہے زاغ ہوں

نواب ناطق انگریزی میں بھی شعر کہتے تھے خواجہ زکریا نے ایک بار یہ سکیم بنائی کہ کسی انگریزی بولنے والے کو نواب ناطق سے ٹکرا دیا جائے چنانچہ ایک صاحب کو لے کر ان کی میز پر پہنچے جن کے بارے میں خیال کیا جاتا تھا کہ بڑی اچھی انگریزی بولتے ہیں چنانچہ انہوں نے نواب ناطق سے جب انگریزی میں گفتگو شروع کی تو نواب ناطق نے جواب میں ایسی انگریزی بولی کہ ان صاحب کو بھاگتے بنی۔ اس دن یہ پتہ چلا کہ موصوف عرصہ دراز تک کسی انگریزی اخبار میں کام کرتے رہے ہیں۔ خواجہ زکریا کو نواب ناطق نے ایک بار بتایا کہ ایک انگریزی پبلشر انہیں ان کے انگریزی دیوان کا معاوضہ ایک لاکھ روپے دے رہا ہے مگر نواب ناطق نے دیوان اس لئے نہیں دیا کہ رقم بہت کم تھی۔

ناصر کاظمی کی نواب ناطق سے اچھی خاصی سلام دعا تھی لیکن جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ وہ موڈی آدمی تھے۔ کبھی کبھی مردم بیزاری کا اظہار بھی کرتے تھے۔ خاص طور پر ان لوگوں سے جن سے انہیں مجبوراً ملنا پڑتا تھا۔ ایک دن ٹی ہاؤس آئے سامنے والی کرسی پر نواب ناطق

بیٹھے تھے ناصر اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھ گئے اور نواب ناطق کو دیکھ کر کہنے لگے۔

''یہ منحوس اب مجھے دیکھ کر یہاں آ جائے گا۔''

ابھی اتنا ہی فقرہ کہا تھا کہ لائٹ چلی گئی ناصر کاظمی اندھیرے میں نواب ناطق کو برا بھلا کہتے رہے۔

''اسے آدمی کون کہتا ہے آدمی کی پیروڈی ہے عجیب مکروہ چہرہ ہے شکل دیکھ کر ڈارون کے فلسفے پر ایمان لانے کو جی چاہتا ہے۔ سالا جب ملتا ہے تو فضول شعر ضرور سناتا ہے۔ اس کا نام نواب ناطق کس نے رکھا ہے خراب ناطق ہونا چاہیے۔''

ناصر کاظمی نے فقرہ ختم ہی کیا تھا کہ لائٹ آ گئی۔ سامنے والی کرسی پر نواب ناطق براجمان تھے جو بجلی جانے کے فوراً بعد خالی کرسی پر آ بیٹھے تھے ناصر کاظمی اسے دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے لیکن فوراً سنبھلے مسکرائے اور کہنے لگے ''ارے نواب صاحب کیا حال ہے آپ کا''۔ لیکن نواب ناطق اٹھ کر چلے گئے اور پھر ناصر کاظمی کے اگلے چند روز نواب ناطق کو منانے میں صرف ہوئے۔

چڑیاں، کبوتر، ہنس، مرغابی، گلہریاں، فاختہ ناصر کاظمی کے من پسند پرندے تھے۔ فطرت کے کھلے میدان میں ان کی اڑانیں ناصر کو بہت بھاتی تھیں۔ ان کا بچپن انبالے میں گزرا تھا۔ وہاں کے باغات، ساون کی رت، بارش، پروائی، درخت، ٹہنیوں پر ہواؤں کے چھیڑے راگ پتوں کی پازیب یہ ساری چیزیں ان کے ذہن میں محفوظ تھیں۔ ان تمام چیزوں کا ذکر وہ اکثر کرتے تھے۔ ناصر کے اندر وہ بچہ تا مرگ زندہ رہا جو امرود چرا کر کھاتا تھا، باغوں میں کھیل کود کر وقت گزارتا، فاختاؤں کے انڈے چراتا درختوں پر چڑھتا اور ہوا کی انگلی پکڑ کر دور تک چلا جاتا اور آخر تھک کر کسی جھاڑی کے پاس بیٹھ جاتا اور ہوا کے گیت سنتا تھا۔ ایک دن میں نے پوچھا۔

''ناصر بھائی آپ ورڈز ورتھ کو اپنے قبیلے کا آدمی سمجھتے ہیں یا نہیں؟''

کہنے لگے۔ ''سمجھتے ہیں کا کیا مطلب؟ وہ ہے''

پھر انہوں نے ماضی کی گرد سے اپنی یادداشتوں کا کھاتا نکال لیا۔

''اس کی اور میری بہت سی باتیں اور چوریاں ایک سی ہیں۔ سکول سے بھاگنا، باغوں میں Cackoo کا پیچھا کرنا۔ ندی کے کنارے بیٹھ کر لہروں کا راگ سننا، کھلی اور صاف شفاف ہوا پینا، پھل چرانا، وغیرہ وغیرہ۔''

ناصر کاظمی نے اس مشاہدے اور تجزیے کو اپنی شاعری میں بڑے سلیقے سے برتا ہے۔ انہوں نے ان چیزوں کے اندر اتر کر ان کے دکھ سمجھے ہیں اور خاموشی سے گفتگو کی ہے۔

فاختہ دیر سے چپ بیٹھی ہے
سرو کی شاخ ہلا کر دیکھو

پھر سردی کی رت آئی
چھوٹے دن اور لمبی رات

یہ دریا خامشی سے بہہ رہا ہے
اسے دیکھیں یا اس میں ڈوب جائیں

اولیں نے رات نے کیا بات بجھائی مجھ کو
یاد آئی تری انگشت حنائی مجھ کو

گیت بنتی ہے تیرے شہر کی مدہوش ہوا
اجنبی میں ہی نہیں تو بھی عجب ہے کوئی

ناصر اکثر لارنس باغ میں کسی درخت کے نیچے گھاس پر پہروں تنہا بیٹھا کرتے تھے۔ وہ پتوں کی تالیاں اور پتوں کی پازیب کی جھنکار سنتے تھے۔ ایک دن میں نے اوپن ائر تھیٹر والی پہاڑی پر انہیں بیٹھے دیکھا۔ بے خبر گم سم ایک جھاڑی کے پاس بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر مسکرائے۔

''کیا حال ہے؟''

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہوں آپ یہاں؟''

میری بات کاٹ کر کہنے لگے ۔ ''جھاڑیاں ہواؤں کو کچھ سندیسے دے رہی تھیں سرگوشیوں میں باتیں کر رہی تھیں میں سن رہا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''آپ نے تو ورڈزورتھ کی بات کہہ دی''۔

''کیا۔''

''اس نے (Prelude) میں بالکل یہی کہا ہے۔''

LYING NEAR THE WILD BUSH

AS THEY GIVE OUT

THIEIR WISPERS TO THE AIR

ناصر کاظمی بہت خوش ہوئے سینہ تان کر کہنے لگے۔

''آخر میرے قبیلے کا آدمی ہے۔ اچھی بات کہنے کا حق رکھتا ہے۔''

پرندوں جانوروں کے قصے ان کی عادات اور Moods کے بارے میں ناصر کو بڑی واقفیت تھی۔ کون سا پرندہ کتنے میل فی گھنٹہ اڑتا ہے۔ گھوڑا غصے میں ہو تو آنکھ کا رنگ کیسا ہو گا۔ گلہریوں کی نفسیات وغیرہ۔ انہوں نے ان کے بارے میں یقیناً پڑھا ہو گا لیکن وہ یہ سب کچھ میل ملاپ سے بھی حاصل کر لیا کرتے تھے۔ تانگے والوں سے یاری، کبوتر بازوں سے دوستی۔ سٹارٹی سٹال پر بیٹھے پرانے گھاگ لوگوں سے گفتگو کر کے انہوں نے بہت فائدہ اٹھایا تھا۔

رات بھر سڑکوں کی خاک چھان کر جب وہ تھک کر کسی ٹی سٹال پر چائے پیتے یا پان والے سے سگریٹ خریدتے تو وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں سے وہ کچھ نہ کچھ لے کر اٹھتے تھے اور پھر اس سونے میں تھوڑی سے پیتل کی ملاوٹ کر کے لوگوں کے ارد گرد حیرانی کا دائرہ کھینچ دیتے تھے ۔ ایک رات انہیں نہ امانت علی خان ملے نہ انتظار حسین کچھ نہ کچھ چاہیے سفر کے لئے کے مصداق انہوں نے مجھے ساتھ رکھ لیا۔ مال، لارنس، ریڈیو سٹیشن، ریگل اور پھر لکشمی چوک۔ رات کے دو

بجے تھے۔ سٹارٹی سٹال پر رکشے اور ٹیکسیوں والے بنچوں پر آلتی پالتی مارے چہک رہے تھے۔ ان سے ہٹ کر ایک بینچ پر میں اور ناصر بیٹھ گئے۔ چائے آئی۔ میں نے چائے پینا شروع کی لیکن ناصر کے کان اس طرف متوجہ تھے جہاں دو ڈرائیور ایک بزرگ آدمی کی باتیں سن رہے تھے۔ پیالی اٹھا کر مجھے کہنے لگے۔

''ادھر چلتے ہیں بہت مزے دار باتیں کر رہا ہے وہ آدمی۔''

میں ان کے پیچھے ہولیا۔ ناصر ان کے قریب پہنچے تو ایک بنچ پر بیٹھ کر کہنے لگے۔

''آپ بات شروع رکھیئے۔ بہت مزہ آ رہا ہے۔''

وہ آدمی کہنے لگا۔

''روح کا ذکر ہو رہا ہے. جی کہ جسم کا پنجرہ چھوڑ کر بھی اسے اوپر چین نہیں آتا کسی نہ کسی طرح کبھی نہ کبھی نیچے آ ہی جاتی ہے۔ چاہے خواب ہی میں کیوں نہ آ جائے۔''

اس آدمی نے سگریٹ سلگائی۔ ایک زوردار کش لیا چائے کی چسکی لی۔ ایسا ہی ایک وقفہ دیا جو ناصر کاظمی اپنی گفتگو کے دوران دیتے تھے۔

''میری خالہ بڑی مالدار عورت تھی لیکن تھی بڑی کنجوس۔ اس کی ایک ہی لڑکی تھی لیکن اسے بھی ایک دمڑی نہ دیتی تھی۔ زیور اور پیسہ کہیں چھپا کر رکھا تھا کسی کو نہ بتلاتی تھی کہ کہاں رکھا ہے۔ جب وہ مری تو اس کی لڑکی نے گھر کا کونہ کونہ چھان مارا مگر ایک دھیلہ نہ ملا۔ بچاری تھک ہار کر بیٹھ گئی۔ جہاں بیٹھی تھی وہیں سوگئی۔ اچانک دروازے پر دستک سن کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ سمجھی اس کا خاوند سفر سے لوٹ آیا ہے۔ بھاگ کر دروازہ کھولا تو سامنے اس کی ماں کا ایک سایہ سا کھڑا تھا۔ وہ ڈری لیکن اس سائے نے اسے تسلی دی اور کہا۔

''سن بیٹی! پیسہ زیور اب میرے کس کام کا وہ اب سب تیرا ہے مگر تو قیامت تک بھی ڈھونڈتی رہے تو تجھے نہ مل سکے گا۔ میں اوپر سے چھٹی لے کر تجھے بتانے آئی ہوں کہ وہ کہاں پڑا ہے۔''

لڑکی کے ہوش درست ہوئے تو اس نے پوچھا۔

"کہاں ہے؟"

ماں کی روح نے جواب دیا۔

"کبوتروں کے ڈربے کے اندر جو پانی کا پیالہ رکھا ہے اس کے نیچے کی چار اینٹیں اکھاڑ لے۔ زیور اور پیسوں کی صندوقچی وہیں رکھی ہے۔"

یہ کہہ کر روح غائب ہوگئی۔ لڑکی نے اینٹیں اکھاڑیں تو سارا زیور وہاں پڑا تھا۔

پہلوان کی بات سن کر سارے حیران رہ گئے لیکن ناصر کاظمی حیران نہ ہوئے بلکہ کچھ سوچتے رہے۔ اِس کا پتہ دوسرے دن ٹی ہاؤس جا کر چلا۔ وہ ایک میز پر لوگوں میں گھرے کہہ رہے تھے۔

"روحیں چین سے نہیں بیٹھتیں۔ پارے کی طرح مضطرب رہتی ہیں۔ سفر کرتی رہتی ہیں۔ میدانوں میں پہاڑوں پر اپنے چھوڑے ہوئے مسکن میں اس گھر میں پلٹ کر اکثر آتی ہیں جہاں جسم کا لباس پہن کر انہوں نے برسوں قیام کیا تھا۔ اپنے چاہنے والوں کو جھلک دکھا کر واپس پلٹ جاتی ہیں۔"

سب لوگ ناصر کی طرف متوجہ تھے انہوں نے کش لیا چائے کی چسکی لی اور کہا۔

"اور کبھی کبھی اپنے ادھورے کام مکمل کرنے کے لئے بھی واپس چلی آتی ہیں۔ فرانس کا ایک مشہور ناولسٹ جب مرا تو اخبار میں قسط وار ایک ناول لکھ رہا تھا۔ ناول کی ابھی چار قسطیں باقی تھیں ایڈیٹر کو پریشانی ہوئی کہ قارئین انجام سے محروم رہ گئے۔ ایک دن ایڈیٹر اپنے دفتر میں بیٹھا تھا کہ مردہ ناولسٹ کی روح دفتر میں داخل ہوئی۔ ایڈیٹر ڈرا لیکن روح نے ہاتھ سے تسلی دے کر کہا۔ "گھبراؤ نہیں مجھے کاغذ اور پنسل دو میں باقی کی چار اقساط مکمل کرنے آئی ہوں" اور مسلسل پندرہ دن تک روح دفتر میں آتی رہی اور جب اقساط مکمل ہوگئیں پھر روح دفتر نہ آئی۔!

پھر بات میری سمجھ میں آئی کہ ناصر کاظمی پہلوان کی کہانی سن کر کیا سوچ رہے تھے۔

ناصر کاظمی سید زادے تھے۔ اپنے آباؤ اجداد پر فخر کرتے تھے۔ کبھی بہت موڈ میں ہوتے تو دعا دے کر قبولیت کی سند ساتھ ہی دے دیا کرتے تھے۔

''جاؤ سید ہوں دعا دیتا ہوں اپنے لئے تو کبھی کچھ نہیں مانگا سید مگر کسی کی سفارش کرے تو اللہ فوراً مان لیتا ہے''

۱۹۵۸ء کے مارشل لاء کے بعد ادیبوں اور شاعروں میں سیاسی شعور کی لہر دوڑ گئی تھی۔ حبیب جالب کی ہنگامہ خیز نظموں نے سارے ملک میں ایک طوفان برپا کر دیا تھا۔ ہر شاعر اور ہر ادیب اپنے اپنے طور پر یہ فرض نبھا رہا تھا کہ اس گھٹن میں کسی نہ کسی پیرائے سے بے ساختہ اظہار کی کوئی نہ کوئی کھڑکی کھولی جائے۔ ٹی ہاؤس میں ادیبوں کی محفلوں میں اکثر یہی بحث چلتی تھی کہ کون کیا کہہ رہا ہے۔ کیسے کہہ رہا ہے۔ اس ضمن میں ایک دن احمد مشتاق نے ناصر کاظمی سے کہا۔

''ظلم کے خلاف آواز اٹھانا سچ بولنا ہر باشعور ادیب ہر شاعر کا فرض ہے۔ تم نے کیا کیا ہے۔''

ناصر نے فوراً جواب دیا۔

''میں سچ بول کر کربلا میں ایک بار گردن کٹا چکا ہوں اب تمہاری باری ہے۔''

ناصر کاظمی نے اپنی زندگی میں کئی جگہ نوکریاں کیں کئی رسالوں کی ادارت کی ویلج ایڈ کے محکمے میں ''ہم لوگ'' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے عرصہ تک کام کیا لیکن اپنی آزادی اور خودداری کو کبھی داؤ پر نہیں لگایا۔ حسب عادت دفتر سے اکثر غائب رہتے۔ جاتے بھی تو بارہ ایک بجے۔ اپنی مرضی سے کام کرتے نہ کسی کو کبھی کچھ کہا اور نہ کسی سے کچھ سنا۔ کسی افسر نے روک ٹوک کی تو

جواب اپنے مخصوص انداز میں دیا۔ ایک بار بارہ بجے کے قریب دفتر پہنچے تو ان کا افسر اعلیٰ دفتر سے رخصت ہو رہا تھا۔ ناصر نے دیکھا تو صورت حال کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لیا۔ افسر نے کہا۔

''آپ اس وقت آ رہے ہیں ناصر کاظمی صاحب؟''

ناصر نے جواب دیا۔

''جی!''

افسر نے کہا۔

''مگر کیوں؟''

''استعفیٰ دینے کے لئے۔''

یہ کہہ کر ناصر نے بات پوری کی۔

''یہ نوکری میرے اہل نہیں مجھے اندر سے خالی کر دیا ہے۔''

افسر اعلیٰ ناصر کاظمی کی اہلیت کے قائل تھے۔ استعفیٰ کا سن کر پریشان ہو گئے کہ رسالے کا کام یہ چلے گئے تو کون سنبھال سکے گا۔ ناصر کاظمی کو بازو سے پکڑ کر اندر لے گیا اور معذرت کے ساتھ عرض کی۔

''اگر آپ کو یہاں کوئی دقت اور تکلیف ہے تو مجھے بتلایئے۔ یہ اچانک استعفیٰ کا خیال کیوں آ گیا۔ اسے ذہن سے نکالئیے۔ آپ چلے گئے تو ہمارا کیا بنے گا؟''

ناصر کاظمی کو ایک بات سے بڑی چڑ تھی اور وہ تھی باری باری سب سے ہاتھ ملانا۔ کہتے تھے۔

''ہماری آدھی زندگی تو لوگوں سے ہاتھ ملانے میں گزر جاتی ہے۔ کہیں جاؤ تو سب سے ہاتھ ملاؤ اٹھ کر چلنے لگو تو سب سے ہاتھ ملاؤ۔''

ایک بار ناصر کاظمی کو کراچی جانا تھا۔ انہوں نے اسی افسر کو پندرہ دن کی چھٹی کے لئے درخواست دی اور اس میں لکھا کہ مجھے کراچی جانا ہے لوگوں سے ہاتھ ملانا ہے۔ اس لئے چھٹی منظور کی جائے۔'' ناصر نے نوکری کو کبھی اہمیت نہ دی ایک بار کہنے لگے۔

''میں نوکری کی کبھی پرواہ نہیں کرتا۔''

کسی نے کہا۔'' آپ تو نوکری کر رہے ہیں اور باقاعدہ دفتر جاتے ہیں اگر پرواہ نہ ہو تو کیوں جائیں''

ناصر نے جواب دیا۔

''یہ نوکری میں لوگوں کی طرح نہیں کرتا۔ خدا بخش بچہ صاحب کو جب میں نے نوکری کے لئے انٹرویو دیا تھا تو صاف صاف کہہ دیا تھا کہ جو تنخواہ آپ نے اخبار میں لکھی ہے میں اس پر کام نہیں کروں گا اگر آپ مجھے چھ ترقیاں ایک ساتھ دینے کا وعدہ کریں تو میں حاضر ہوں۔ انہوں نے میری شاعرانہ حیثیت کو دیکھتے ہوئے فوراً میری بات مان لی۔'' ناصر کاظمی کی زندگی میں یہی نفسیات تا مرگ کام کرتی رہی کہ وہ ہر حیثیت میں لوگوں میں منفرد رہیں۔ چاہے شاعری ہو گفتگو نوکری یا غربت۔

ناصر کاظمی کتوں سے بہت ڈرتے تھے۔ کتے کو دور سے دیکھ کر راستہ کاٹ جاتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ پیٹ میں آٹھ ٹیکے لگوانے سے بہتر ہے کہ آدمی اپنا سفر دو فرلانگ اور لمبا کر لے۔ انہوں نے جانوروں، چڑیوں، راستوں، گلیوں اور سڑکوں سے آشنائی پیدا کی مگر کتے سے راہ رسم نہ بڑھا سکے۔ کبھی کبھی وہ اس خوف سے کسی نہ کسی کو اپنا ہم سفر بنا لیتے تھے جو انہیں گھر تک پہنچا آئے۔

شدید سردی کا موسم تھا۔ رات کو ایک بجے مجھے ہاسٹل کے چپڑاسی نے کہا کہ آپ کو ناصر کاظمی بلا رہے ہیں۔ میں نیچے اترا تو ولز ہوسٹل کے لان میں ناصر کاظمی ٹہل رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر بولے۔

''کیا کر رہے ہوں؟''

''پڑھ رہا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

''تم پڑھ رہے ہو۔ رات کا قافلہ روانہ ہونے کو ہے۔''

میں ان کی بات سمجھ گیا۔

''میں ابھی آیا۔''

میں اپنے کمرے میں گیا میرا روم میٹ دانش رضا سو رہا تھا۔ میں نے چپکے سے اس کا اوورکوٹ اٹھایا جو اس نے پچھلی شام ہی لنڈے سے خریدا تھا اور نیچے اتر کر ناصر کاظمی کے ساتھ ہو لیا۔ انارکلی، سٹیشن، میکلوڈ روڈ، مال سے ہوتے ہوئے ہم کرشن نگر میں داخل ہوئے۔ ۳ بج چکے تھے۔ کتے بوکھلائے ہوئے پھر رہے تھے۔ کتوں کے سلسلے میں میں ناصر سے بھی زیادہ ڈرپوک تھا مگر میں نے کبھی ان پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ہم کتوں سے بچتے بچاتے ناصر کاظمی کے گھر تک آئے۔ انہوں نے دستک دی۔ دروازہ کھلا وہ اندر داخل ہوئے۔ مجھے خدا حافظ کہا اور دروازہ بند کر لیا۔ میں واپسی کے لئے پلٹا تو دس کتوں کا ایک جاندار دستہ میرے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے قدم بڑھایا تو وہ بھونکنے لگے۔ میں چلا تو وہ پیچھے دوڑے۔ میں دوڑا تو انہوں نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ناصر کاظمی کا گھر بالکل چند قدم پر تھا۔ مجھے اور تو کچھ سوجھا نہیں میں نے اوورکوٹ اتار کر چاروں طرف لہرایا تو کتے اور شیر ہو گئے۔ اپنے اس دفاعی قدم میں میں نے ذرا تیزی دکھائی تو کوٹ میرے ہاتھ سے چھوٹ کر ایک کتے پر جا گرا اور گرا بھی اس طرح کہ اوورکوٹ کے بازو میں اس کا سر پھنس گیا وہ اس آفت ناگہانی سے گھبرا گیا اوورکوٹ کے بازو سے اپنا سر نکالنے کے لئے چاروں طرف گھومنے لگا۔ کتے کو اپنے سر کی پریشانی تھی۔ مجھے اس کوٹ کی پریشانی تھی جو دانش رضا کل خرید کر لایا تھا۔ کتے کے چاروں طرف چکر لگانے سے سب کتے کوٹ کو اک بلا سمجھ کر بھاگ گئے اور میں کتے سے کوٹ چھیننے کی تگ و دو کرنے لگا۔ کتا ۵۰ گز کے دائرے میں دیر تک بھاگتا رہا اور میں کتے کے پیچھے دوڑتا رہا۔ آخر کتے نے زور لگا کر سر کو کوٹ کے بازو سے نکالا۔ کوٹ اچھل کر دور جا گرا۔ کتے کے چہرے پر بلا کا خوف تھا۔ اس نے چند لمحے کوٹ کے بے ترتیب بکھرے بازوؤں کو دیکھا اور پھر بھونکنے کی بجائے ایک خوفناک چیخ مار کر بھاگ گیا۔ میں نے جا کر کوٹ اٹھایا تو ناصر کاظمی نے اپنی کھڑکی سے جھانک کر کہا۔

''یار کتے سے بچنے کا یہ تو بہت آسان طریقہ ہے۔ Good میں یوں ہی ڈرتا رہا۔ کل میں بھی ایک اوورکوٹ خریدوں گا۔'' اور پھر کھڑکی بند کر لی۔

ناصر کاظمی کوڈھونڈ نے کے لئے دوگھاٹوں کا گرم پانی پینا پڑتا تھا۔ٹی ہاؤس اور لارڈز (Lords)۔انتظار حسین ،اعجاز حسین بٹالوی اور ناصر کاظمی ٹی ہاؤس کی محفل سرد پڑتی تو لارڈز میں ڈیرہ جما لیتے تھے اور پھر اکثر یوں بھی ہوا کہ میں لارڈز کے باہر کھڑا شیشے میں سے ناصر کاظمی کو دیکھتا رہتا اور جب وہ اٹھ کر باہر آتے تو ملاقات ہوتی۔اس ملاقات ہونے کا دارومدار ان کے موڈ پر تھا۔کبھی کبھی وہ باہر آتے تانگہ لیتے اور گھر چلے جاتے اور کبھی کبھی چند قدم چل کر کہیں ادھر ادھر غائب ہو جاتے۔وہ اہل ایماں کی طرح صورت خورشید زندگی بسر کرتے تھے۔اس گلی میں ڈوب کر اس گلی کی نکڑ سے طلوع ہونا ان کی عادت تھی۔ایک رات میں ناصر کاظمی کو ڈھونڈ کر جب تھک گیا تو ریگل چوک میں آ کر مولیٰ بخش سے ایک پان لینے کے لئے رکا۔بجلی کی سرعت سے پڑیوں میں پان لپیٹنے والے لڑکے سے میں نے کہا۔

''ایک پان الائچی سپاری۔''

پیچھے سے ایک آواز آئی۔

''ایک پان سادہ چونا ذرا زیادہ''۔

میں نے پلٹ کر دیکھا تو ناصر کاظمی تھے۔

''ناصر بھائی آپ میں تو دو گھنٹے سے آپ کو ڈھونڈ رہا ہوں۔''

لڑکے سے سادہ پان پکڑ کر بولے۔

''ہم اتنے کم عرصے میں دستیاب ہونے والے لوگ نہیں۔''

جب ریگل چوک کراس کر کے شیزان کے سامنے آئے تو کہنے لگے۔

''تمہاری ایک شکایت ملی ہے۔''

''کیا؟''میں نے پوچھا۔

''تم خالد احمد اور گوہر ہوشیار پوری کے ساتھ ساری ساری رات ریگل چوک میں کھڑے برفی کھاتے رہتے ہو پڑھتے پڑھاتے کچھ نہیں۔''

میں نے مسکرا کر کہا۔

''ان کے ساتھ تو میں آٹھ بجے تک ہوتا ہوں ۔ راتیں تو میں نے آپ کے نام کی ہوئی ہیں۔''

ناصر کاظمی کو تسلی ہوئی تو مطمئن ہو کر کہنے لگے۔

"good اور سناؤ کیا حال ہیں؟''

میں نے حال بتلایا۔ ناصر کاظمی کا یہ تکیہ کلام تھا۔ اگر وہ آپ کے ساتھ ایک گھنٹہ رہیں گے تو کم از کم بیس بار آپ سے پوچھیں گے۔

''اور سناؤ کیا حال ہیں؟''

ان کے پاس جب کہنے کے لئے کچھ نہ ہوتا تو وہ ساتھ چلنے والے کا حال پوچھ لیتے۔ حالانکہ ہم سفر کئی بار انہیں اپنے حال سے آگاہ کر چکا ہوتا تھا۔ یہ اسی رات کا ذکر ہے جس رات انہوں نے خالد احمد اور گوہر ہوشیار پوری کے ساتھ برفی کھانے کی شکایت کی تھی۔ وہ خاموشی سے میرے ساتھ چلتے رہے۔ ٹی ہاؤس بند تھا۔ ۱۲ بجے کا وقت تھا۔ کمرشل بلڈنگ کے سامنے ایک آدمی موٹر سائیکل کے پاس کھڑا اسے گالیاں دے رہا تھا۔ ناصر کاظمی اس کی آواز پہچان کر کہنے لگے۔

''حسن لطیف للک ہے۔''

حسن لطیف بہت خوبصورت (Composer) تھا۔ بقول ایک اچھے موسیقار وہ جتنی اچھی دھن بناتا تھا اس کا (Arrangement) اتنا ہی برا کرتا تھا۔

میں اور ناصر کاظمی اس کے قریب پہنچے تو ناصر کاظمی نے ٹھیٹ پنجابی میں کہا۔

''توں جناں چنگا میوزک ڈائریکٹر ایں موٹر سائیکل اونہی ای بھیڑی اے۔''

للک نے جواب دیا۔

''تے فیر میں کی کراں؟''

''اسے بیچ دو''۔ ناصر کاظمی نے مشورہ دیا۔

پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ حسن لطیف نے کیا بات شروع کی۔ ناصر نے کیا جواب دیا۔ لیکن

ہوایوں کہ حسن لطیف موٹر سائیکل گھسیٹ کر ناصر کے ساتھ چلتا رہا۔ سکریٹریٹ چوک، ہائی سکول
کرشن نگر کا بازار سب گزر گئے اور ناصر کاظمی کا گھر آ گیا۔ دستک دی گئی۔ دروازہ کھلا اور ناصر نے
اندر جا کر ہمیں کہا۔

''خدا حافظ''۔ اور دروازہ بند کر لیا۔

حسن لطیف نے میری طرف دیکھا۔ میں نے مسکرا کہا۔

''انہیں کہتے ہیں ناصر کاظمی''۔

حسن لطیف نے موٹر سائیکل زمین پر لٹائی اور دروازے پر زور سے دستک دی۔
تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا ناصر کاظمی نے گردن باہر نکالی۔

''کیا ہے؟'' ناصر کاظمی بولے۔

''تمہیں ایک اطلاع دینی ہے''۔ حسن لطیف نے کہا۔

''کیا؟''

''وہ یہ کہ تم جتنے اچھے شاعر ہو اتنے ہی برے آدمی ہو'' حسن لطیف نے ہاتھ ہلا کر
کہا۔

''تو میں کیا کروں؟''

''شاعر کو رکھ لو اس برے آدمی کو بیچ دو۔''

''اچھا یہ کام صبح کروں گا۔'' دروازہ پھر بند ہو گیا
اور پھر موٹر سائیکل گھسیٹ کر اور حسن لطیف کو سہارا دے کر (A.G.) آفس کے پیچھے
اسلم گورداسپوری کے دفتر تک پہنچانا میری ڈیوٹی تھی۔ جو میں نے نبھائی۔

حسن لطیف ایک پڑھا لکھا موسیقار تھا۔ کہتے ہیں فیروز نظامی کے بعد وہ دوسرا
موسیقار تھا جو بی اے تک پہنچا۔ موسیقی کے ساتھ ساتھ بڑا عمدہ شعری ذوق رکھتا تھا۔ ٹی ہاؤس
میں شاعروں ادیبوں کی مجلسوں میں اکثر شریک ہوتا اور بڑھ چڑھ کر ادبی بحثوں میں حصہ لیتا۔
ناصر کاظمی سے بہت بنتی تھی دوسری جنگ عظیم کے زمانے کی ایک موٹر سائیکل پر پورا لاہور گھومتا تھا

بقول ناصر کاظمی۔

''دوسری جنگ عظیم میں ہٹلر کی ساری ڈاک اسی پر آتی تھی۔''

مجھے اس پر بیٹھنے کا شرف حاصل ہے میں گورنمنٹ کالج شیخوپورہ میں تھا اور روز لاہور آتا جاتا تھا۔ایک دن ناصر کاظمی مجھے کہنے لگے۔

''یہ جو تم نوکری کرر ہے ہو کیا فائدہ اس کا۔ جو کماتے ہو ریلوے والوں کو دے دیتے ہو۔ کچھ ہونا چاہیے۔''

''مثلاً کیا؟''میں نے کہا۔

''لاہور ٹرانسفر۔''ناصر کاظمی کہنے لگے۔''ابھی حسن لطیف آئے گا۔اس کی جیب میں بڑے بڑے جگادری افسروں کے کارڈ پڑے رہتے ہیں۔اسے کہتا ہوں کوئی کارڈ نکالے۔''

حسن لطیف آئے۔ناصر کاظمی نے ٹرانسفر کی بات کی۔حسن لطیف کہنے لگے۔

''ناصر کاظمی! ٹرانسفر اس طرح نہیں ہوتی۔تم بتلاؤ ٹرانسفر کون کرتا ہے۔کیا نام ہے پھر میں جانوں اور میرا کام۔''

ناصر کاظمی کہنے لگے۔

''یہ تمہارا اسلم گورداسپوری کس دن کام آئے گا۔ہم تم سے فیکٹری (Loan) منظور کرانے کے لئے تو نہیں کہہ رہے۔''

حسن لطیف کچھ سوچ کر بولے۔

''بالکل ٹھیک کہا تم نے۔''

اور پھر حسن لطیف مجھے موٹر سائیکل پر بٹھا کر اسلم گورداسپوری کے پاس لے گیا۔ جب میں اس کی موٹر سائیکل پر بیٹھ رہا تھا تو ناصر کاظمی نے چپکے سے میرے کان میں کہا۔

''اس کی موٹر سائیکل کو پٹرول پمپ دیکھ کر پیاس ستانے لگتی ہے۔اگر حسن لطیف پیٹرول ڈلوانے کے لئے کہے تو پیدل ٹی ہاؤس واپس چلے آنا۔''

لیکن اس دن موٹر سائیکل کو کوئی پیاس محسوس نہیں ہوئی۔

کبوتر اڑاتے اڑاتے ناصر کاظمی کی نفسیات مکمل طور پر کبوتر بازوں کی نفسیات بن گئی تھیں۔ایک کبوتر باز کبھی اپنے کبوتر کو کسی دوسرے کبوتر باز کی چھتری پر دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ناصر کاظمی تعلقات اور دوستی کے ضمن میں پکے کبوتر باز تھے۔کبھی پسند نہیں کرتے تھے کہ کوئی ان کا چاہنے والا کسی دوسرے کے قریب پھٹکے۔کوئی ایسا کرتا تو بگڑ جاتے۔

۱۹۶۴ ـ ۶۵ء میں ناصر کاظمی اور سید عبدالمجید عدم کے تعلقات کچھ اتنے اچھے نہ تھے۔ ایک بار ناصر کاظمی نے عدم صاحب کے ایک شعر کی پیروڈی کر دی باتوں باتوں میں پیروڈی کی صنف کا ذکر چھڑا تو ناصر کاظمی کہنے لگے۔

''پیروڈی کے لئے کوئی توپ تو نہیں چلانا پڑتی کبھی کبھی ایک دو لفظ بدلنے سے پیروڈی ہو جاتی ہے۔سید عبدالمجید عدم کے ایک شعر میں ایک دو لفظ بدل دو۔سارا مفہوم بدل جاتا ہے۔مثلاً ان کا شعر ہے۔

محفل میں اس خیال سے پھر آ گیا ہوں میں
شاید مجھے نکال کے پچھتا رہے ہیں آپ

اس شعر میں پچھتا کی جگہ ''کچھ کھا'' کر دو تو ہو گئی پیروڈی

محفل میں اس خیال سے پھر آ گیا ہوں میں
شاید مجھے نکال کے کچھ کھا رہے ہیں آپ

یہ پیروڈی کسی نے عدم صاحب کو سنا دی۔وہ غصے میں آ گئے کہنے لگے۔
''ناصر کاظمی کو آتا ہی کیا ہے۔اس نے آج تک خود ایک شعر نہیں کہا۔سب کچھ میر کا ہے۔''

اور پھر یہ قطعہ کہہ دیا۔

کوا کیوں کائیں کائیں کرتا ہے
طوطا کیوں ٹائیں ٹائیں کرتا ہے
شعر ہوتے ہیں میر کے ناصر
لفظ کچھ دائیں بائیں کرتا ہے

ناصر کو یہ قطعہ سنایا گیا تو وہ کہنے لگے۔

''لفظ دائیں بائیں کرنا آسان کام نہیں جوئے شیر لانے کے برابر ہے۔عدم صاحب سے کہو یہ کام کر کے تو دیکھیں۔''

اس واقعہ کے بعد ناصر عدم صاحب سے ذرا پرے پرے ہی رہتے تھے۔ میں نے ایم۔اے کیا تو عدم صاحب نے مجھے کہا۔

''عقیل روبی! چلو تمہیں انکم ٹیکس انسپکٹر لگوا دوں۔''

میں نے کہا۔''شاہ جی! یہ میرے بس کا روگ نہیں۔کہاں لوگوں کی آمدنی کا حساب کرتا پھروں گا۔''

عدم صاحب کہنے لگے۔

''پاگل نہ بنو ایک سال کے بعد گھر بھی ہو گا کار بھی فیکٹریوں والے تمہارے پیچھے پیچھے نوٹ لے کر پھریں گے۔''

مجھے چپ دیکھ کر عدم صاحب کہنے لگے۔

''اس کا ذکر ناصر کاظمی سے نہ کرنا۔ چپکے سے کل آجاؤ میں تمہیں تجمل حسین کے پاس لے چلتا ہوں انکم ٹیکس کمشنر ہیں۔کھڑے کھڑے تمہیں انسپکٹر لگا دیں گے۔''

میں ساری رات خواب میں نوٹ گنتا رہا۔صبح اٹھا تو خواب کی تعبیر دیکھ کر بڑا اداس ہوا۔ناصر کاظمی سے ملاقات ہوئی۔عدم صاحب کی تجویز بتلائی۔بہت بگڑے کہنے لگے۔

"رشوت کی دلدل میں ہی چھلانگ لگانا تھی تو ادب میں ماسٹرز کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ذہن کو زنگ لگانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ عدم صاحب کے ساتھ تجمل حسین کے پاس۔ مگر اسپکٹر ہو جاؤ تو میرے پاس نہ آنا۔" اور پھر میرا جواب سنے بغیر چلے گئے۔

ایم۔اے کا امتحان دے کر میں فارغ تھا۔ نتیجے کا انتظار کر رہا تھا۔ قتیل شفائی ان دنوں رائٹرز گلڈ کے سیکرٹری تھے مجھے کہنے لگے جب تک رزلٹ نہیں آتا گلڈ میں بیٹھا کرو اور بیٹھنے کا معاوضہ دو سو روپے طے پایا۔ حبیب کیفوی کے علاوہ یہاں مرزا ادیب بھی تھے۔ ایک دن ہمدردی میں مرزا ادیب کہنے لگے۔

"عقیل روبی ایم اے میں فرسٹ کلاس آنا بے حد ضروری ہے۔ تمہارا ایک پرچہ ڈاکٹر سید عبداللہ کے پاس ہے میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ ان سے میں سفارش کر دیتا ہوں۔"

میں نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ مرزا صاحب ساری زندگی اس احساس میں جلتا رہوں گا کہ سید صاحب سفارش نہ مانتے تو میں فرسٹ کلاس نہ لے سکتا۔ میں نے مرزا ادیب کے ہمدردانہ مشورہ کا ذکر کیا تو ناصر کاظمی کہنے لگے۔

"مجھ سے دور رہو گے تو ایسے ہی فضول مشورے سنو گے۔ مرزا ادیب بہت اچھے آدمی ہیں لیکن تجویز اچھی نہیں۔ سفارش کی کشتی پہ دریا پار جاہل کرتے ہیں۔ سجاد باقر رضوی اور ناصر کاظمی کے چیلے نہیں۔"

باقر صاحب کے سلسلے میں ان کا رویہ اتنا سخت اور برا نہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ہمارا ان سے اتنا ملنا جلنا باقر صاحب پسند نہیں کرتے تھے۔ اس ناپسندیدگی کی وجہ اس کے علاوہ کچھ نہ تھی کہ ہم ناصر کاظمی کے ساتھ رات گئے تک گھوم پھر کے اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ ناصر کاظمی باقر صاحب کی بہت عزت کرتے تھے۔ چنانچہ جب کبھی ہم ان کے پاس ہوتے اور باقر صاحب آ جاتے تو وہ ادھر ادھر دیکھ کر کہتے۔

"تمہارے پروفیسر باقر آ رہے ہیں ادھر ادھر ہو جاؤ فضول میں مجھے گالیاں دلواؤ گے۔ آتے ہی برسیں گے کہ ناصر کاظمی تم میرے طالب علموں کو خراب کر رہے ہو۔"

پھر مسکرا کر کہتے۔

''حالانکہ تمہارے احترام اور محبت نے میرا بیڑا غرق کر دیا ہے۔''

ناصر کاظمی دوستوں کی محفل میں جھوٹ سے بہت کام لیتے تھے۔ معصومیت کی ساکت اور پرسکون جھیل پر کنول کے پھول کی طرح تیرتے جھوٹ سے کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچتی تھی۔ بلکہ حیرانی ہوتی تھی اور حیرانی ہر اچھی اور نئی چیز کو دیکھ کر اور سن کر ہوتی ہے۔ ناصر کاظمی سچائی کی اینٹوں سے بنی دیوار کو مبالغہ آرائی اور جھوٹ کے پلستر سے مضبوط اور دیدہ زیب بناتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اکیلا سیمنٹ دیوار پر اپنی گرفت مضبوط نہیں رکھ سکتا اس لئے اس میں ریت کی مقدار شامل کر لیتے تھے۔ سونے میں کھوٹ کا ٹانکا لگا کر زیور بناتے تھے۔ اور ناصر کاظمی کے جھوٹ سے بنی دیواریں اتنی دلکش ہوتی تھیں کہ ہر کوئی ان کے سائے میں ستا کر تازہ دم ہو جاتا تھا۔

(Writers at Work) مشہور انگریزی شاعروں کے انٹرویو پر مبنی ایک تازہ کتاب ہے۔ اس میں (W.B.Yeats) کا ایک انٹرویو چھپا ہے۔ انٹرویو کے پینل میں ورجینیا وولف بھی شامل ہے ۔ اٹلی کے ایک میوزیم کی تفصیل بتلاتے ہوئے (W.B.Yeats) نے کہا کہ وہ میوزیم کی سیر کر رہے تھے کہ سیڑھیوں کے پاس انہیں ایک خوبصورت یونانی عورت کا مجسمہ نظر آیا جس نے اپنی گود میں ایک بچہ اٹھایا ہوا تھا۔ میں نے اس بچے کی ناک پر انگلی رکھ کر کہا۔

How Are You?

بچے نے میری بات سن کر یونانی زبان میں مجھ سے باتیں شروع کر دیں اور گھنٹوں مجھ سے باتیں کرتا رہا۔ ہر بڑا ادیب اور مصنف کچھ ایسے ہی کرتا ہے۔ سچائی میں کچھ حیرت کچھ مبالغہ کچھ جھوٹ تب ہی جا کر بات بنتی ہے۔ لان جائی نس نے اپنی کتاب (On The Sulime) میں ہومر

Homer کے جھوٹ کا ذکر کیا ہے اور کہتا ہے ہومر نے اوڈی سی میں بہت جھوٹ بولا ہے لیکن سچ بنا کر۔ دنیا کے ادیبوں کو جھوٹ نہیں بولنا چاہیے۔ اگر ضروری ہے تو جھوٹ بولنے کا فن ہومر سے سیکھنا چاہیے۔ ناصر کاظمی کا یہ فن ہومر کی طرح کمال کی حد تک پہنچ جاتا تھا۔ ہومر (Homer) کی کتاب شروع کریں تو ختم کر کے ہی دم لینا پڑتا ہے۔ ناصر کاظمی کی گفتگو سننے بیٹھیں تو وہ دم بھی نہیں لینے دیتے تھے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی کہنے لگے کہ ایک بار مسز ناصر کاظمی سے کسی نے پوچھا کہ ناصر کاظمی جھوٹ بہت بولتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا۔

''ہاں لیکن میں جلد ہی سچ تک پہنچ جاتی ہوں جبکہ لوگوں کو بہت دیر لگتی ہے۔ عیب کرنے کو بھی ہنر چاہیے۔''

بہاولپور ایس۔ای۔کالج میں ۱۸ ستمبر ۱۹۶۵ء کو تقرری ہوئی۔ عابد صدیق سوز اسلم انصاری پہلے سے وہاں موجود تھے۔ ریگستان کی ہتھیلی پر رکھا یہ شہر اپنی پوری مشرقی اور ریاستی روایات کے ساتھ بہت اچھا لگا لیکن اس شہر میں اداسی بہت تھی۔ اداسی کی یہ چادر صرف چند ہی دن میرے شانوں پر رہی اس کے بعد شانوں سے ڈھلک کر پیروں میں آ گری۔ آل احمد، ظہور نظر، پروفیسر سہیل اختر اور صحافی گلزار اختر، حیات میرٹھی اور ادیب واثقی کی ادبی اور پر لطف محفلوں میں قہقہے گونجنے لگے۔ ایس۔ای کالج میں شاگرد بھی ایسے ملے جن کا ادبی ذوق کسی صورت کسی اچھے باذوق ادبی قاری سے کم نہ تھا۔ ظہور نظر کا بھانجا عظمت کمال (جواب ڈاکٹر عظمت کمال ہے) کافکا۔ موپساں، شیکسپیر، میکسم گورکی اور ٹالسٹائی کو کھا پی کر فرسٹ ائیر میں داخلہ لینے آیا تھا۔ نیاز لکھویرا (جواب پنجاب آرٹس کونسل کا ڈپٹی ڈائریکٹر ہے) شاعری کی جدید اور کلاسیکل روایت پڑھ پڑھا کر میرا شاگرد بنا تھا۔ اس کے علاوہ ظہور نظر کا ڈمپل ہوٹل اور اس ہوٹل میں بیٹھنے والے لوگ سب بے مثال تھے۔ لیکن ان سب چیزوں کے باجود لاہور اور لاہور کے لوگوں کی یادیں کمبل بن کر دل کے بدن سے لپٹی ہوئی تھیں۔ رات ڈھلے جب کرب کی دھند آنکھوں میں اترتی تو میں لاہور کی طرف بھاگتا۔ اس زمانے میں اتوار کو چھٹی ہوتی تھی۔ میرا ہفتہ اتوار اکثر لاہور میں گزرتا۔ سجاد باقر رضوی ٹی ہاؤس اور ناصر کاظمی۔ تکون کے یہ تین سرے تھے جن کے درمیان میں لاہور آ کر بھاگتا رہتا تھا۔ بہاولپور سے تھکا ہارا آتا اور تازہ دم ہو کر پیر کو بہاولپور واپس چلا آتا۔ ایک بار آیا لاہور میں دو دن گزارے واپس جانے لگا تو ناصر کاظمی کہنے لگے۔

''اتنی جلدی کیا ہے؟ ایک دن اور ٹھہر جاؤ۔''

''نہیں ناصر بھائی ٹھہر نہیں سکتا۔''

''کیوں؟''

''بدھ کے دن کالج میں شام کو ایک مشاعرہ ہے۔ مجھے جا کر سارے انتظامات کرنے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''تو ٹھیک ہے۔ بدھ کے روز بہاولپور میں ملاقات ہوگی، تم سے۔''

ناصر کاظمی نے مجھ سے ہاتھ ملا کر کہا۔

میں بہت خوش ہوا۔ بوکھلا کر کہا۔

''یعنی آپ آئیں گے بہاولپور۔''

''کیوں، کیوں نہیں آؤں گا۔ وہ کوئی میرے لئے شہر ممنوع تو نہیں۔''

ناصر بھائی نے سگریٹ کا کش لے کر کہا۔

میں نے کہا۔ ''بالکل شہر ممنوع نہیں۔ وہاں کا ہر فرد آپ کا مداح ہے۔''

''تو بس میں آ رہا ہوں۔''

میں ناصر کاظمی کی یہ بات سن کر بہاولپور چلا آیا۔ نیاز لکھویرا بزم ادب کا سیکرٹری تھا۔ اسے ناصر کاظمی کی آمد کی اطلاع دی۔ اس نے لڑکوں کو بتلایا۔ سب بہت خوش تھے۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان اس وقت سہیل بزمی تھے۔ ان کے والد شاید بہاولپور میں تھے۔ سہیل سے میری ملاقات ہوئی۔ سہیل نے نیا نیا بی اے کیا تھا۔ لیکن ذہانت ایم اے کے طالب علموں سے کہیں زیادہ۔ اندر ایک آگ تھی جو کچھ دیر بعد بھڑکی۔ میں نے بتلایا کہ ناصر کاظمی آ رہے ہیں۔ وہ بھی بدھ کا انتظار کرنے لگے۔ پیر کو مجھے ڈاک کا ایک پیلا لفافہ ملا۔ لفافے پر لکھے پتے سے میں نے ناصر کاظمی کی تحریر پہچان لی۔ لفافہ کھولا۔ صرف دو سطریں لکھیں تھیں۔

عقیل روبی!

میں بدھ کو آ رہا ہوں۔ تم روشنی کا اچھا سا اہتمام کر لینا۔

تمہارا

ناصر کاظمی

روشنی کا لفظ واوین میں لکھا تھا۔ میں نے لفافہ جیب میں رکھا اور لڑکوں میں اعلان کر دیا کہ ناصر کاظمی کی آمد یقینی ہے۔

بدھ کا دن آ گیا۔ میں نے اس کمرے میں جہاں ناصر کاظمی کو ٹھہرنا تھا ۲۰۰ وولٹ کا بلب لگوایا۔ تا کہ کمرہ روشنی سے جگمگا جائے۔ کالج کے ہال میں مشاعرے کے انتظامات پر خاص توجہ دی۔ مشاعرہ شروع ہو گیا۔ لیکن ناصر کاظمی نہیں آئے۔ ہر کوئی مجھ سے پوچھ رہا تھا ''ناصر کاظمی نہیں آئے'' میں کیا جواب دیتا۔ مشاعرہ ختم ہونے کے قریب تھا۔ مہمان شعراء کو بلانے کا کام میرے ذمے تھا۔ میں مائیکروفون پر اعلان کر رہا تھا کہ ایک لڑکا بھاگا ہوا آیا کہ باہر تانگے میں ناصر کاظمی بیٹھے ہیں میں نے کہا جاؤ ناصر کاظمی کو لے آؤ اور خود مائیک پر اعلان کرنے لگا کہ خواتین و حضرات ناصر کاظمی آ گئے ہیں۔ تشریف رکھئے۔ تھوڑی دیر کے بعد نیاز بھاگتے ہوئے آئے اور کہنے لگے۔

''ناصر کاظمی صاحب چلے گئے ہیں''

''کیوں؟'' میں نے گھبرا کر پوچھا۔

نیاز خاموش رہا۔

''کچھ بتلاؤ کیوں چلے گئے ہیں؟''

نیاز نے بڑی ہمت سے کہا۔

''وہ کہتے ہیں کہ تمہارا استاد عقیل روبی بہت بدتمیز ہے۔ میں لاہور سے بہاولپور آ گیا وہ مجھے لینے اندر سے باہر نہیں آ سکتا۔ لڑکے بھیج دیئے۔''

نیاز کی بات سن کر مجھے اپنی بدتمیزی کا احساس ہوا۔ ننگے پاؤں باہر کی طرف بھاگا۔ باہر آ کر دیکھا ناصر کاظمی کا تانگہ جا رہا تھا میں نے اس دن زندگی کی تیز ترین دوڑ لگائی جیسے کسی نیک آدمی کو دیکھ کر شیطان سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے منہ زور گھوڑے کی طرح پھلانگتا ہوا ناصر کاظمی

کے تانگے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اور اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے ناصر کاظمی نے بہت ڈانٹا برا بھلا کہا۔ میں کچھ نہ بولا خاموشی میں عافیت دیکھی وہ بولتے رہے میں سنتا رہا۔

''عجیب نامعقول انسان ہو مہمان نوازی کی روایت ہی بھول گئے۔ میں تمہارے پاس آیا تم نے مجھے لڑکوں کے سامنے ڈال دیا۔''

میں خاموش رہا مجھے پہلی بار پتہ چلا کہ خاموشی واقعی سونا ہے۔ اس لمحے اگر میں بولتا تو لوہا بن جاتا۔ ناصر کاظمی نے مجھے گھور کر دیکھا اور تانگے والے کو واپسی کا حکم دیا ہال سے دوبارہ ناصر کاظمی کا لڑکوں نے استقبال کیا۔ لوگوں نے تالیاں بجا کر خوش آمدید کہا۔ ناصر کاظمی نے بے شمار غزلیں سنائیں لوگوں نے اتنی داد دی کہ ناصر کاظمی میری بدتمیزی بھول گئے مشاعرہ کے اختتام پر مجھ سے کہنے لگے۔

''بہت اچھے لوگ ہیں یہاں کے۔ میں نے اتنا شعری ذوق کسی شہر کے لوگوں میں نہیں دیکھا۔''

پھر جب ہم تانگے پر گھر واپس آ رہے تھے تو تانگے والے سے کہنے لگے۔

''کیوں بھائی تم کندن لال سہگل کو جانتے ہو؟''

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ میں نے پوچھا کہ سہگل کا اس تانگے والے سے کیا تعلق؟ ناصر نے جواب دیا۔

''تقسیم ہند سے پہلے کندن لال سہگل نواب آف بہاولپور کی بگھی چلاتا تھا یہ تانگے والا ضعیف ہے میں نے سوچا شاید یہ جانتا ہو۔''

ناصر کاظمی نے میرا گھر پسند کیا کمرے میں چاروں طرف نظر ڈالی جب میں نے کھانا لگایا تو میری طرف دیکھ کر کہنے لگے۔

''روشنی''

میں نے بلب کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''۲۰۰ کا بلب جلدی میں مل سکا اور پھر۔''

ناصر کاظمی میری بات کاٹ کر بولے۔

''آج پتہ چلا کہ شعر تم خود نہیں کہتے ۔شاعر ہوتے تو روشنی کا بلیغ استعارہ ضرور سمجھ جاتے۔'' اور کھانا ایک طرف کر دیا۔

میں نے اپنی کم فہمی پر سر پیٹ لیا۔ سائیکل رکشہ لے کر سارا شہر چھان مارا گھر گھر دستک دے کر کرن کرن روشنی اکٹھی کی ۔۲ بجے رات واپس گھر لوٹا۔ روشنی کا دستہ میرے ساتھ دیکھ کر ناصر کاظمی پھولے نہ سمائے ۔روشنی کے دائرے میں بیٹھ کر کھانا کھایا، خوب باتیں کیں گفتگو کی آبشار سورج کی پہلی کرن دیکھ کر رکی تو ناصر کاظمی سو گئے ۔شام ۴ بجے جاگے تو کہنے لگے۔

''سنا ہے یہاں کی کبوتر منڈی بہت قدیم اور پرانی ہے۔''

نیاز نے اثبات میں سر ہلایا تو ناصر کہنے لگے۔

''چلو کوئی مہذب اور خاندانی کبوتر باز ضرور ہوگا۔ ریاست کا اپنا ایک مزاج اور کلچر ہوتا ہے۔''

ہم ناصر کاظمی کو لے کر کبوتر منڈی پہنچے تو بڑی بڑی چار پائیوں پر بیٹھے پرانے بوڑھوں سے ناصر کاظمی نے کبوتروں کی اقسام پر بڑی سیر حاصل بحث کی انہیں کبوتروں کی نفسیات اور عادات پر ایسی ایسی باتیں بتلائیں کہ بڑے بڑے کبوتر بازوں نے دانتوں میں انگلیاں دے لیں اور ناصر کاظمی کو اپنا گرو مان لیا۔ ناصر کاظمی کی نظر میں کوئی کبوتر نہ جچا جب وہ کبوتر بازوں سے ہاتھ ملا کر چلنے لگے تو ایک بوڑھے کبوتر باز نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''سائیں ۔اے کبوتر باز کیہڑی منڈی دا بیوپاری اے؟''

میں نے اس کے کان کے قریب جا کر کہا۔

''بابا! یہ کبوتر باز نہیں قلیم سخن کا شہزادہ ہے شعروں کا بیوپاری ہے۔''

''ہوگا۔'' بوڑھے نے کہا۔'' مجھے تو پڑھا لکھا کبوتر باز لگتا ہے۔''

رات کو سندھ ایکسپریس پر سوار کرانے کے لئے ہم سٹیشن پر گئے تو سہیل احمد خان ہمارے ساتھ تھے۔ اپنے ایک شاگرد گارڈ کو میں نے کہا'' دھیان رکھنا لاہور تک ناصر کاظمی کو کوئی

تکلیف نہ ہونے پائے۔'' ناصر کاظمی کو فرسٹ کلاس کے ڈبے میں بٹھا کر ہم نے ان سے ہاتھ ملائے۔ گاڑی چل دی۔ ہم نے الوداعی رسم نبھائی جب گاڑی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی تو سہیل احمد خان مجھے کہنے لگے۔

''یار عقیل روبی لاہور سے ہوائی سروس بہاولپور آتی ہے''۔

میں نے کہا۔

''نہیں۔ ہوائی سروس تو ملتان بھی نہیں آتی۔ کیوں؟''

''کچھ نہیں میں نے ناصر کاظمی سے پوچھا کہ آپ کب آئے تو اس نے جواب دیا کل جہاز سے آیا تھا۔''

دو دن بعد ریلوے گارڈ پریشان میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔

''عقیل روبی صاحب! یہ کیسا مسافر آپ نے میرے سپرد کر دیا تھا؟''

''کیوں کیا ہوا؟'' میں پوچھا۔

''بہاولپور سے گاڑی چلی تو لودھراں رکی۔ لودھراں سے چلی تو میں نے دیکھا کہ ناصر کاظمی گاڑی سے اتر کر پیدل چل رہے ہیں میں نے گاڑی رکوائی پیچھے بھاگ کر ان کے پاس گیا انہیں گاڑی میں سوار ہونے کے لئے کہا تو کہنے لگے۔ آپ گاڑی لے جائیں میں پیدل آؤں گا۔ میں نے لاکھ منتیں کیں مگر وہ نہ مانے آدھ گھنٹہ اس تکرار میں گزر گیا آخر مسافروں کی بحث و تکرار کے بعد میں نے گاڑی چلا دی۔ آخر یہ ناصر کاظمی کیا چیز ہیں؟''

میں مسکرا دیا لیکن رات کو سویا تو ایک تشویش لاحق ہوگئی۔ میں نے ہفتے کا انتظار نہ کیا جمعہ کے روز لاہور چلا گیا ناصر کاظمی سے ملا۔ بہاولپور کی خاص جوتیاں ناصر اور بھابی کے لئے پیش کیں کہنے لگے۔

''اچھا تو اب میں جوتیوں کے لائق رہ گیا ہوں''۔

''یہ میں آپ کی نہیں۔ آپ کے پیروں کی نذر کر رہا ہوں''۔

کھانا کھا کر جب ذرا خوشگوار موڈ میں آئے تو میں نے گاڑی کے واقعہ کا ذکر کیا کہنے

لگے۔

''عجیب بے وقوف تھا تمہارا وہ گارڈ۔ میں کہہ رہا تھا جاؤ گاڑی لے جاؤ مگر وہ بہ ضد تھا کہ گاڑی میں بیٹھو۔''

''مگر آپ گاڑی سے اترے کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''کوئی خاص وجہ نہ تھی مجھے کھڑکی میں چاند اکیلا اور اداس نظر آیا۔ مجھ سے اس کا اکیلا پن برداشت نہیں ہوا گاڑی رکی تو میں اتر گیا۔''

''پھر؟'' میں نے پوچھا۔

''پھر کیا چاند کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا ملتان آ گیا۔ ۲ بجے پہنچا۔ ریاض انور کے گھر چلا گیا ناشتہ کیا سو گیا شام کو انوار انجم سے ملا عرش صدیقی سے ہیلو ہیلو کیا رات کو گاڑی پکڑی اور لاہور آ گیا۔'' یاد رہے کہ لودھراں سے ملتان کا فاصلہ تقریباً ۴۰ میل ہے جو بقول ناصر انہوں نے پیدل طے کیا۔

۱۹۷۵ء تک پاکستان میں بڑے خالص مشاعرے ہوتے تھے۔ خالص اس لحاظ سے کہ اس میں صرف شعر کہنے والے شرکت کرتے تھے۔ ''دلہن وہ جو پیا من بھائے'' والا معاملہ نہ تھا کہ جو میری ''دف'' کے آدمی ہیں ویگن میں لاد کرلے جاؤں اور وہ اکلوتی غزل سنا کر واپس لوٹ آئیں۔ گئے دنوں میں ایسا نہ تھا۔ مشاعرہ میں وہی جاتا تھا جسے شعر کہنا آتا تھا۔ جوش، احسان دانش، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، طفیل ہوشیار پوری، احمد فراز، شہزاد احمد، محسن احسان، ناصر کاظمی، جعفر شیرازی، حاجی بشیر، ظہور نظر، فارغ بخاری، خاطر غزنوی، مظفر وارثی، منور سلطانہ لکھنوی، بسمل صابری شوق سے مختلف شہروں میں بلوائے جاتے اور سنے جاتے تھے۔ اس زمانے میں مشاعرہ ایک ادبی سالانہ فیسٹیول تھا۔ اہل ذوق سارا سال مخصوص دن کا انتظار کرتے اور پھر ساری رات شاعروں کو سنتے اور اس طرح ساری رات بیت جاتی۔

ناصر کاظمی باقاعدہ مشاعرہ پڑھنے والے شاعر تھے۔ میں نے ان کے ساتھ لاتعداد مشاعروں میں شرکت کی۔ ترنم میں کبھی پڑھتے نہیں سنا۔ پڑھتے وقت ان کی آواز کا کھرج بڑا بھلا لگتا تھا۔ عام زندگی میں میرا بائی اور کبیر داس کے دوہے ترنم میں پڑھتے تھے اور وہ بنگالی آہنگ میں ایس ڈی برمن کی طرح گنگناتے اچھے لگتے تھے۔ مشاعروں کے دوران ان کے قریب رہ کر بڑا اچھا لگتا تھا۔

''پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ'' والے سودائی سیالکوٹ میں بڑا کامیاب مشاعرہ کراتے تھے۔ اصغر بڑے فقیر منش آدمی تھے۔ جناح اسلامیہ کالج سیالکوٹ میں پرنسپل تھے۔ وہ مشاعرہ میں آنے والے کسی شاعر کے ساتھ معاوضہ طے نہیں کرتے تھے۔ جتنا فنڈ ہوا خرچہ نکال

کر اسے شاعروں پر تقسیم کر دیتے۔ شاعر خوش خوش گھروں کو سدھارتے۔ شاعروں کو مشاعرہ کی تاریخ کا پتہ تھا۔ اصغر سودائی کہتے تھے کہ دیکھو یار وا گلے سال مجھے خط نہ لکھنا پڑے تاریخ پڑھ کے خود ہی چلے آنا اور واقعی شاعر خود ہی چلے آتے تھے اور ایسے بھی جنہیں کبھی بلایا ہی نہیں گیا تھا لیکن اصغر سودائی انہیں ہنس کر خوش آمدید کہتے۔

میں اصغر سودائی کے بیشتر مشاعروں میں شریک ہوا۔ بڑے دلچسپ آدمی تھے۔ مشاعرہ خود کنڈکٹ کرتے تھے۔ کبھی فہرست نہیں بناتے تھے۔ شاعروں کو دیکھتے رہتے جسے بلانا ہوتا اسے انگلی سے اشارہ کر دیتے وہ سمجھ جاتا کہ اب میری باری ہے۔

<u>۱۹۶۷ء</u> میں غالباً یہ ۲۳ مارچ کا مشاعرہ تھا۔ مشاعرہ زوروں پر تھا۔ بسمل صابری پڑھ رہی تھیں اور اصغر سودائی کی نظریں ناصر کاظمی کو ڈھونڈ رہی تھیں انہوں نے سٹیج پر بیٹھے شاعروں پر نظر ڈالی مگر انہیں ناصر کاظمی نہ ملے۔ مجھ سے نظریں چار ہوئیں تو اشارے سے پوچھا کہ ناصر کاظمی کہاں ہیں۔ میں نے اشاروں اشاروں میں بتلایا کہ وہ پنڈال کے باہر گئے ہیں۔ بسمل صابری مقطع پڑھ رہی تھیں۔ اصغر سودائی نے انہیں روکا اور مائیک پر اعلان کیا کہ خواتین کی طرف سے پر زور سفارش ہے کہ بسمل یہ ساری غزل دوبارہ سنائے۔ بسمل صابری کی خوبصورت آواز اور یہ شعر

مسافر ہیں ٹھکانہ چاہتے ہیں۔

خوبصورت عورت شہریوں کے ہجوم میں یہ مصرع پڑھے تو شہریوں کو مہمان نوازی کی روایت یاد آ جاتی ہے۔ جوں ہی بسمل یہ مصرع پڑھتیں سارا ہجوم پکارتا۔ ''حاضر''

اصغر سودائی کے کہنے پر بسمل صابری دوبارہ غزل پڑھنے لگیں اور اصغر سودائی ناصر کاظمی کو ڈھونڈنے پنڈال سے باہر چلے گئے۔ ۵ منٹ گزر گئے تو میں یہ دیکھنے کے لئے پنڈال سے باہر چلا گیا کہ آخر یہ دونوں حضرات کہاں چلے گئے ہیں۔ پنڈال سے باہر دکان پر ناصر کاظمی کھڑے تھے اور اصغر انہیں کسی اور طرف ڈھونڈ رہے تھے۔ میں نے اصغر سودائی کے قریب جا کر کہا۔

''وہ کھڑے ہیں ناصر کاظمی۔''

ہم دونوں ناصر کاظمی کے پاس پہنچ گئے اور پھر ناصر اور اصغر سودائی میں عجیب وغریب

گفتگو شروع ہوگئی۔ اصغر سودائی کو دیکھ کر ناصر کاظمی بولے۔

''آیئے آیئے پان کھائیں گے آپ؟''

''ضرور مگر چونا ذرا کم۔''

''چونے کی تلخی ہی تو پان کی اصل جان ہے۔''

ناصر نے انگلی پر لگے چونے کو زبان سے چاٹ کر کہا۔

''یار میں پنجابی ہوں میں کیا جانوں پان کا مزہ۔''

''میں کون سا لکھنوی یا دہلوی ہوں۔ انبالے کا رہنے والا ہوں۔ پنجاب سے دو ہاتھ کے فاصلے پر تو تھا۔''

ناصر پان والے کو پیسے دینے لگے تو اصغر سودائی نے دکاندار سے کہا۔

''نہیں بھئی پیسے نہ لینا یہ مہمان ہیں۔''

''نہیں نہیں اصغر بھائی! مہمان کہاں ہم تو آپ کے شاعر بھائی ہیں۔ آپ بھی تو ہمیں بلا کر پیسے دیتے ہیں۔''

ناصر کاظمی کی یہ بات سن کر اصغر سودائی چونکے اور کہنے لگے۔

''ناصر کاظمی میں مارا گیا۔ تم سیالکوٹ کیوں آئے ہو؟''

ناصر کاظمی نے جواب دیا۔

''کبوتر دیکھنے''۔

''بھلے آدمی وہ تو تم کل دیکھ لینا، اب یہاں کیا کرنے آئے ہو؟''

''مشاعرہ پڑھنے۔''

''تو چلو پنڈال کے اندر، میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ وہاں بسمل صابری ایک ہی غزل پڑھ پڑھ کر بے ہوش ہو جائے گی۔''

''وہ تو نہیں ہوگی لوگ ضرور بے ہوش ہو جائیں گے۔''

ناصر کاظمی نے سگریٹ سلگائی اور پھر اصغر سودائی کا ہاتھ پکڑ کر اندر پنڈال میں چلے

گئے۔

جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں اس زمانے میں وی سی آر اور ڈش کی لعنت نہیں تھی۔ زمانہ کم عیار تھا۔ ادبی ذوق مفلوج اور مرا نہیں تھا۔ چھوٹے شہروں میں تو مشاعرہ کا اعلان سن کر ہل چلانے والے بھی پنڈال میں آ بیٹھتے تھے ایک مشاعرہ وہاڑی میں ہر سال شیڈول ہوتا تھا جو غلام رسول انصاری کراتے تھے۔ انصاری صاحب پروفیسر عابد صدیق سوز کے بڑے بھائی ہیں۔ اچھے شاعر ہیں اور قدیم انداز میں بڑے اچھے شعر کہتے تھے۔۔۔۔۔۔غالباً یہ ۱۹۶۸ء کا کوئی مہینہ تھا میں بہاولپور سے لاہور آیا۔ ناصر کاظمی سے ملاقات ہوئی۔ وہ وہاڑی مشاعرہ میں جانے کے لئے تیار تھے۔ مجھے کہا چلو۔ میں نے کہا میں تو وہاں بلایا ہی نہیں گیا۔ ناصر کاظمی کہنے لگے۔

''تمہیں وہاں جانے سے کون روک سکتا ہے؟''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر۔۔۔۔۔''

ناصر کاظمی نے بات کاٹ کر کہا۔

''بک بک بند کرو تم میرے ساتھ جا رہے ہو۔ انصاری نے تمہیں کچھ نہ دیا تو اپنے آدھے پیسے تمہیں میں دے دوں گا۔''

ہم لاہور سے لیٹ بس میں سوار ہوئے، وہاڑی پہنچے تو مشاعرہ شروع ہو چکا تھا۔ بہت بڑا ہجوم تھا۔ پنڈال کے باہر کھڑے ریہڑوں اور ٹرالیوں سے اندازہ ہوتا تھا مشاعرہ نہیں ہم کسی تھیٹر یا سرکس کے پنڈال میں آ گئے ہیں۔ سٹیج پر احسان دانش، احمد ندیم قاسمی، طفیل ہوشیار پوری، قتیل شفائی اور دوسرے شعراء بیٹھے تھے۔ سٹیج کی نکڑ کے پاس بسمل صابری اور مرحومہ منور سلطانہ لکھنوی بیٹھی تھیں۔ دونوں نے ساڑھیاں پہنی ہوئی تھی۔ میں اور ناصر کاظمی لوگوں کے ہجوم کو چیرتے ہوئے سٹیج کے قریب پہنچنے کی کوشش کرتے ہوئے سٹیج سے کچھ فاصلے پر دیہاتیوں کی ایک منڈلی کے پاس آ کر رک گئے۔ دو دیہاتی ایک بوڑھا اور ایک ذرا کم عمر نوجوان اکڑوں بیٹھے تھے۔ نوجوان آنکھیں پھاڑے منور سلطانہ لکھنوی اور بسمل صابری کو دیکھ رہا تھا۔ بسمل نے سفید

ساڑھی پہنی ہوئی تھی اور منور سلطانہ نے آف وائٹ۔ دونوں نے گہرا میک اپ کیا ہوا تھا اور اتفاق سے دونوں نے جوڑے میں پلاسٹک کا پھول لگایا ہوا تھا۔ ان میں سے غالباً کوئی ایک غزل پڑھ چکی تھی۔ دونوں کا غضب کا ترنم تھا۔ بوڑھے دیہاتی نے نوجوان کا شانہ ہلا کر کہا۔

''چل رکھے چل بڑی دیر ہوگئی اے۔''

نوجوان نے بغیر بوڑھے کی طرف دیکھے کہا۔

''چاچا! ٹھہر جا او چٹے لیٹریاں والی کنجری دا گانا سن کے چلاں گے۔''

''لاحول ولاقوۃ۔'' ناصر کاظمی نے ان کی بات سن کر میرے شانے پر ہاتھ رکھ کے مجھے ہلایا۔ ''اگر یہ کنجریاں ہیں تو ہم ان کے ساتھ ہیں۔ ہم کیا ہوئے؟'' ناصر کا موڈ آف ہو گیا، اپنی جیب سے پان نکال کر منہ میں رکھا۔ اس دوران غلام رسول انصاری کی نظر ان پر پڑ گئی اور ہم سٹیج پر جا بیٹھے۔۔۔ مشاعرہ اڑھائی بجے ختم ہوا۔ کچھ شعراء ٹھہر گئے۔ بیشتر بس کے اڈے کی طرف روانہ ہو گئے۔ ناصر کاظمی کہنے لگے۔

''عقیل روبی! اس وین میں نہیں بیٹھنا جس پر بسمل اور منور سلطانہ بیٹھ رہی ہیں۔''

''تو پھر اڈے تک کیسے چلیں گے؟''

''پیدل۔'' ناصر کاظمی بولے۔

رات کے اڑھائی بجے تھے۔ اجنبی شہر، نہ راستوں سے وہ واقف نہ میں۔ میں نے کچھ سوچ کر کہا۔

''دیکھئے! ایک تو اس شہر میں کتے بہت ہیں اور یہ تو آپ جانتے ہیں کہ دیہاتی کتا شہری کتے سے زیادہ خونخوار، بہادر اور باغیرت ہوتا ہے اور دوسری بات یہ کہ منور اور بسمل کو خطاب دینے والے کب کے گھر جا چکے ہیں۔''

ناصر کاظمی میری بات سن کر کچھ سوچنے لگے اچانک دور سے کسی کتے کے بھونکنے کی آواز آئی۔ ناصر نے اس سمت دیکھا جس طرف سے آواز آئی تھی اور میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگے۔

''جلدی سے وین کو روکو۔ اڈے تک اسی وین میں چلتے ہیں۔''

بس کا اڈا زیادہ دور نہیں تھا۔ وہاں دو ہوٹل تھے، خواتین اور کچھ شاعر ایک بلڈنگ کی طرف بڑھے۔ شاید مشاعرہ والوں نے وہاں چائے کا انتظام کیا ہوا تھا۔ مگر ناصر کاظمی میرا ہاتھ پکڑ کر ایک چھوٹے سے ہوٹل کی طرف بڑھے جس کے دروازے پر چھوٹا سا بورڈ لگا ہوا تھا۔ جس پر لکھا تھا" کاکے دا ہوٹل "۔ ہوٹل کے اندر دس بیس کرسیاں رکھی تھیں۔ کاؤنٹر کے پاس ایک کرسی پر طفیل ہوشیار پوری مرحوم بیٹھے سو رہے تھے۔ ان کا بریف کیس میز پر رکھا تھا اور کاؤنٹر کے اندر کرسی پر ایک موٹا سا آدمی سو رہا تھا۔ کاؤنٹر سے ذرا ہٹ کر چائے اور کھانا پکانے کے لئے چولہے بنے ہوئے تھے جن پر دیگچیاں رکھی ہوئی تھیں اور ایک لڑکا چائے بنا رہا تھا۔ ہم نے دو چائے کا آرڈر دیا اور طفیل ہوشیار پوری سے ذرا دور کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ہوٹل میں سوائے طفیل ہوشیار پوری کے بے حد بے ہنگم خراٹوں کے اور کوئی آواز نہیں آ رہی تھی ناصر کاظمی ہوٹل کے مالک اور طفیل ہوشیار پوری کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ چند ساعتوں کے بعد مجھے کہنے لگے۔

''سبحان اللہ، کیا اچھا منظر ہے۔ خراٹا طفیل لیتے ہیں اور اس کا ردعمل ہوٹل کے مالک کے چہرے پر ملتا ہے۔''

میں نے غور سے دیکھا واقعی عجیب منظر تھا۔ طفیل کا خراٹا عجیب وغریب آواز نکالتا تھا۔ خوخوخو۔۔۔ خوموشی۔ خاخاخاخت۔۔۔ یہ آواز سن کر ہوٹل کا مالک اپنے چہرے سے بیزاری کا اظہار کرتا تھا۔ اچانک ایک زوردار خراٹے سے مالک کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے آنکھیں مل کر چاروں طرف دیکھا۔ پھر طفیل ہوشیار پوری پر اس کی نظر پڑی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر طفیل ہوشیار پوری کو بیدار کیا۔

''باؤ جی، اے باؤ جی!''

طفیل کے خراٹے رکے اور وہ نیند سے بیدار ہوئے اور ہوٹل کے مالک سے کہنے لگے۔

''ہاں بھئی کی گل اے؟''

''باؤ جی ایہہ کی کر رہے او؟'' کاکا بولا۔

''نیند پوری کرریاواں۔''طفیل ہوشیار پوری نے کہا۔

''کدی کسے چنگے ہوٹل پے نئیں گئے۔'' کاکا بولا۔

''بالکل۔''طفیل بولے۔

''کسے نیں کجھ نئیں کہیا۔'' کاکا طنزا بولا۔

''کہیا سی۔''طفیل نے کہا۔

''کی کہیا سی؟'' کاکا دلچسپی لے کر بولا۔

''اوہناں نیں کہیا سی کہ طفیل صاحب، ایسے طراح کرناں اے تے فیروباڑی کاکے دے ہوٹل جاکے کرو۔''

ہوٹل کا مالک طفیل کی یہ بات سن کر ہکابکا رہ گیا اور طفیل ہوشیار پوری پھر سو گئے اور خراٹے لینے لگے۔ کاکے نے طفیل صاحب کو دیکھا ہماری طرف دیکھ کر مسکرایا اور خود بھی سو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک آدمی ہوٹل میں آیا اور کہنے لگا۔

''لاہور جانے کے لئے سپیشل بس تیار ہے۔ لاہور جانے والے آ جائیں۔''

ہم اٹھے، طفیل صاحب کو جگایا اور بس میں بیٹھ گئے۔ لاہور تک کا سفر بہت اچھا کٹا۔ ہم سب جاگ رہے تھے۔ صرف ایک شاعر سو رہا تھا اور وہ تھے طفیل ہوشیار پوری۔

غالباً ۱۹۷۰ء کے قریب کا واقعہ ہے قتیل شفائی ملتان سے لاہور ٹرین میں آ رہے تھے کہ پنکھے سے ان کا ہاتھ ٹکرایا اور ان کی انگلی کٹ گئی۔ سیالکوٹ کے مشاعرہ میں ان سے ملاقات ہوئی۔ ناصر کاظمی اور باقر صاحب لاہور سے آئے تھے۔ سٹیج پر قتیل شفائی بیٹھے تھے۔ میں ناصر کاظمی اور باقر صاحب کی طرف جانے کی بجائے سیدھا قتیل شفائی کی طرف گیا اور ان کے پاس بیٹھ گیا۔ انگلی کٹنے کی تفصیل پوچھتا رہا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ میں مشاعرہ کے اختتام تک ناصر سے نہ مل سکا۔ مشاعرہ ختم ہوا اور کچھ ایسی افراتفری پیدا ہوئی کہ ناصر اور باقر صاحب کو ڈھونڈا تو وہ لاہور کے لئے روانہ ہو چکے تھے۔

میں لاہور آیا۔ ناصر کاظمی کے گھر گیا وہ ریڈیو جا چکے تھے۔ ریڈیو پہنچا تو وہ ٹی ہاؤس چلے گئے تھے۔ ٹی ہاؤس پہنچا تو وہ دروازے کے ساتھ والے صوفے پر اکیلے بیٹھے تھے۔ میں سلام کر کے ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ انہوں نے میرے سلام کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں سمجھ گیا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ میں نے بولنا مناسب نہیں سمجھا۔ ناصر کاظمی نے ٹی ہاؤس کے ویٹر الٰہی بخش کو آواز دی۔ وہ آیا تو اس سے کہنے لگے۔

''الٰہی بخش ان صاحب سے کہئے کہ کہیں اور جا کر بیٹھیں۔''

الٰہی بخش نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

''عقیل روبی صاحب، آپ نے ناصر صاحب کا پیغام سن لیا۔''

''ہاں سن لیا۔'' میں نے کہا۔ ''ناصر صاحب سے پوچھئے کہ میں یہاں نہ بیٹھوں تو کہاں بیٹھوں؟''

الٰہی بخش نے ناصر کاظمی کی طرف دیکھ کر کہا۔

''کیوں صاحب جی، یہ یہاں نہ بیٹھیں تو کہاں بیٹھیں؟''

''قتیل شفائی کے پاس جا کر بیٹھیں''

میں ساری بات سمجھ گیا۔ چین کا سانس لیا اور الٰہی بخش سے کہا۔

''الٰہی بخش صاحب، ناصر کاظمی صاحب سے کہئے کہ اگر کسی کا ہاتھ پنکھے میں آجائے اور انگلی کٹ جائے تو کیا اس سے زخمی انگلی کی تیمارداری کرنا بری بات ہے؟''

یہ بات سن کر ناصر کاظمی الٰہی بخش کی بجائے مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔

''کس کی انگلی کٹ گئی؟''

''قتیل شفائی کی۔''

''کب؟''

''پچھلے مہینے، ملتان سے لاہور آتے ہوئے۔''

''تم عجیب بدتمیز ہو، مجھے بتلایا ہی نہیں۔'' ناصر جھنجھلا کر کہنے لگے۔

''آپ نے پوچھا ہی نہیں۔''

قتیل صاحب، کا فون نمبر ہے تمہارے پاس؟''

''جی!''

''لاؤ۔''

میں نے فون نمبر دیا۔ انہوں نے کاغذ پر لکھا اور کھڑے ہو کر کہنے لگے۔

''آؤ، جی۔ پی۔ او سے چل کر قتیل شفائی کو فون کریں۔ آخر ہماری بھی دس انگلیاں ہیں کسی وقت بھی پنکھے میں آسکتی ہیں۔''

میرے دوست شفاعت کے بڑے بھائی ڈاکٹر مشتاق میلسی میں ہیلتھ آفیسر تھے۔ انہیں میلسی جیسے گاؤں میں کوئی ہنگامہ کرنے کی سوجھی۔ لاہور آئے مجھے کہنے لگے میں میلسی میں ایک مشاعرہ کرانا چاہتا ہوں، تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ میں نے حامی بھرلی۔ ۵۰۰ روپے فی شاعر قرار پائے۔ میں نے ناصر کاظمی سے ذکر کیا بہت خوش ہوئے کہنے لگے۔

"good میلسی میں کبوتر بھی دیکھ لیں گے۔"

میں نے کہا۔

"انہوں نے صرف ۵ شاعر بلوائے ہیں۔ کس کس کو لے کر چلیں؟"

ناصر کاظمی نے دونوں ہونٹوں کے کونے میں جمی پان کی تل چھٹ صاف کی اور کچھ سوچ کر کہا۔

"ہاں یہ تو واقعی سوچنے کی بات ہے۔"

پھر سگریٹ سلگائی، دھواں چھوڑا اور بولے۔

"میں، تم۔۔۔ تم منور سلطانہ کے ہاں رہتے ہو؟"

"ہاں"

"ایک وہ ہوگئیں۔ ایک ان کا بھائی ٹسن لکھنوی بڑا غضب کا مزاحیہ شاعر ہے۔ کیا ہے اس کی غزل کا مشہور مطلع

کوٹ پتلون ہو، کالر میں لگی ٹائی ہو
اس کو یہ ضد ہے کہ عاشق میرا عیسائی ہو

میں نے شعر سن کر کہا۔

''ہاں پانچواں شاعر ناصر بھائی۔''

وہ سر کے بالوں میں ہاتھ پھیر کر بولے۔

''ہاں پانچواں شاعر۔''

''عدم صاحب کو نہ لے چلیں۔''

''ٹھیک ہے کوئی حرج نہیں، میلسی میں لوگ ان کے اشعار بہت پسند کریں گے۔''

مقررہ دن ہم پانچوں لاہور سے میلسی کی طرف روانہ ہو گئے۔ میلسی چھوٹا سا شہر ہے۔ مشاعرہ کا پنڈال ہسپتال کے لان میں بنایا گیا تھا۔ لوگ حقے لے کر مشاعرہ سننے آئے تھے۔ ناصر کاظمی انہیں دیکھ کر کہنے لگے۔

''لاحول ولا'' یہ مشاعرہ سنیں گے۔ میں تو واپس جا رہا ہوں۔''

میں نے کہا آپ گولی ماریں انہیں، ایک غزل سنا دیں۔ ۵۰۰ روپے لیں صبح سویرے بس پکڑ کر لاہور چلے چلیں گے۔ ملتان کے شاعر اقبال ارشد اور سحر رومانی کے کہنے پر انہوں نے ارادہ بدل دیا۔ مشاعرہ شروع ہوا۔ مزاحیہ شاعر رشید رہتکی کا ایک شعر ۲۰ بار سنا گیا۔ شعر تھا

بٹوا نہ میری جیب میں پائے گا تو اے دوست

اس جیب میں غزلیں ہیں ادھر مونگ پھلی ہے

جب ایک منچلے نے ۲۱ ویں بار مکرر کہا تو ناصر کاظمی سٹیج سے اٹھ کر جانے لگے۔ ہم نے ان کو روکا۔ وہ ہاتھ جھٹک کر کہنے لگے۔

''چھوڑو یار، یہ کس بکواس مشاعرے میں لے آئے ہو۔ شاعر مونگ پھلی بیچ رہے ہیں، تم بیٹھو میں مونگ پھلی لاہور سے خرید لوں گا۔''

عدم صاحب نے ناصر کاظمی کا ہاتھ پکڑ لیا اور کھینچ کر بٹھا لیا۔ ناصر کاظمی نے بے دلی سے غزل سنائی۔ عدم صاحب آخری شاعر تھے۔ مشاعرہ ختم ہوا۔ ڈاکٹر مشتاق مجھے ایک طرف لے گئے اور میرے ہاتھ میں دو ہزار روپے پکڑا دیئے۔ میں نے کہا مگر ہم پانچ شاعر ہیں۔ ڈاکٹر

مشتاق مسکرا کر کہنے لگے۔

''تم تو بھائی ہو۔ جیسا شفاعت ویسے تم۔ تمہیں تو پیسے دوں بھی تو تمہیں نہیں لینے چاہئے۔''

میں چپ رہا۔ دور کھڑے ہوئے شاعروں کے پاس آ گیا۔ ناصر کاظمی اور عدم صاحب کو تقسیم معاوضہ کی پوری کہانی سنائی۔ ناصر کاظمی بہت سٹ پٹائے۔

''یہ تو بہت زیادتی ہے۔ تم نے مشاعرے کا اہتمام کیا ہمیں لے کر آئے اور تمہیں کچھ نہ ملا۔''

منور سلطانہ کہنے لگیں۔

''آپ کو مشاعرے والوں سے بات کرنا چاہیے۔''

''کوئی فائدہ نہیں، بس جو ہو گیا ہو گیا۔'' میں نے ان چاروں کو پانچ پانچ سو روپے دیتے ہوئے کہا۔

ناصر کاظمی کہنے لگے۔

''یہ بہت غلط بات ہے۔ عقیل روبی تمہیں مشاعرہ کا معاوضہ ملنا چاہئے۔ ہم چاروں ایک ایک سو روپیہ تمہیں دیں گے۔''

منور سلطانہ اور تسن لکھنوی نے فوراً کہا کہ یہ تجویز ٹھیک ہے۔ عدم صاحب ایک طرف چلے گئے۔ ناصر کاظمی ان کے پیچھے چل دیئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ناصر ہمارے پاس آ گئے اور ان کے بعد عدم صاحب۔۔۔ ناصر کاظمی عدم صاحب سے کہنے لگے۔

''عدم صاحب! ہم نے عقیل روبی کو سو سو روپیہ دے دیا ہے۔ آپ بھی ایک سو روپے دے دیں۔'' چار چار سو ہمارے!

عدم صاحب جیب سے چار نوٹ نکال کر کہنے لگے۔

''میرے پاس تو پہنچے ہی ۴ سو روپے ہیں۔''

میں نے پریشان ہو کر کہا۔

''نہیں عدم صاحب میں نے پورے پانچ سو دیے ہیں''

''نہیں یار یہ دیکھو۔'' عدم صاحب نے نوٹ گننے شروع کر دیئے۔ ''ایک، دو، تین، چار۔''

''اور پانچواں نوٹ آپ کی دائیں جراب میں ہے۔''

ناصر کاظمی نے عدم صاحب کے دائیں جوتے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''کیا بکواس کرتے ہو ناصر کاظمی۔'' عدم صاحب بڑے بھولے انداز میں بولے۔

''بکواس نہیں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ ابھی ابھی جب آپ اس درخت کی طرف گئے تھے تو میں بھی آپ کے پیچھے گیا تھا۔ آپ نے سوچا کہ آپ کو کوئی نہیں دیکھ رہا مگر میں آپ کو نوٹ چھپاتے دیکھ رہا تھا۔

''بالکل غلط''

''ٹھیک ہے آپ جراب اتار دیں۔ اگر نوٹ نہ ہوا تو میں سو روپے دوں گا۔'' ناصر کاظمی نے سو روپے کا نوٹ جیب سے نکال کر لہرایا۔

عدم صاحب کھانسنے لگے اور جب کھانسی رکی تو کہنے لگے۔

''ناصر کاظمی میں جراب اتار سکتا ہوں مگر اتاروں گا نہیں۔''

''کیوں؟'' ناصر بولے۔

''اتنی غلیظ اور میلی ہے کہ بدبو سے تمہارا سر چکرا جائیگا۔''

لاہور واپسی کے لئے بس میں سوار ہوئے تو عدم صاحب میرے ساتھ بیٹھے تھے۔ سب مسافر سو رہے تھے۔ میں بھی اونگھ رہا تھا۔ عدم صاحب نے مجھے شانہ ہلا کر بیدار کیا اور سو روپے میری طرف بڑھائے۔ میں نے نوٹ دیکھ کر کہا۔

''یہ کیا شاہ جی؟''

''میرے حصے کا سو روپیہ''۔ عدم صاحب مسکرا کر آہستہ سے بولے

''ناصر کاظمی کی آنکھ بڑی تیز ہے میں نے بڑی پھرتی دکھائی تھی مگر اس نے مجھے دیکھ لیا۔ کبوتر باز کہیں کا۔''

ناصر کاظمی شاعروں اورادیبوں کے اس قبیلے کے فرد تھے جوخون دل جلا کرفن کی بھٹی کو روشن رکھتے ہیں۔ایسے لوگ کسی گروپ یا تنظیم کا سہارا لے کرشہرت اور ناموری کی کھونٹی پر اپنے نام کی تختی نہیں ٹانکتے بلکہ عام روشوں سے ہٹ کرا کیلےفن کی تخلیق کا عذاب جھیلتے ہیں۔ان کے ہم عصران سے لاکھ نالاں ہوں وہ آئندہ نسلوں کے لئے تخلیقی عمل جاری رکھتے ہیں اور گزرتے لمحوں کی ہتھیلی پرفن کے چراغ سجاتے رہتے ہیں تاکہ مستقبل ان کی فکر سے اپنی بنیادیں مضبوط کرلے۔ یہ میراتھن دوڑ کے وہ کھلاڑی ہیں جو مر کر بھی صدیوں وقت کی گزرگاہ پر شہرت کا پرچم لے کر دوڑتے رہتے ہیں۔

ناصر کاظمی میں بڑے شاعروں کی خوبیاں اور خامیاں یکجا ہوگئیں تھیں ۔ ان کی شخصیت اور شاعری ایک دوسرے سے بری طرح لپٹے ہوئے ہیں جو اداسی اور خوشگوار غم کی کیفیت ناصر کے شعر میں ہے وہی ان کی شخصیت میں نمایاں تھی۔اداسی شعر میں آتی تو ان کے گھر کی دیواروں پر بال کھول کر سوتی تھی۔ یہی اداسی ناصر کاظمی کی خشک آنکھوں میں بھی بکھری نظر آتی تھی۔ براؤن کوٹ پہنے بایاں ہاتھ کوٹ کی جیب میں ڈالے ایک دبلا پتلا آدمی جب لاہور کی ویران سڑکوں پر اکیلا پھرتا نظر آتا تو سونے راستے بھی اس کے اکیلے پن اور اداسی پر سرگوشیاں کرتے تھے۔

ناصر کاظمی نے یونانی شاعر ہومر (Homer) کی طرح عام زندگی میں جھوٹ کو قابل یقین سچ بنا کر پیش کیا۔ 007 جیسی فلمیں بنانے والے ڈائریکٹر سے کسی نے پوچھا کہ یہ تم نا قابل فہم اور نا قابل یقین باتوں کو کیسے قلم میں کھپاتے ہو؟ اکیلا (Jmes Bond) سارے

روس میں تباہی مچا کر واپس پلٹتا ہے تو اس کے کوٹ پر کوئی شکن تک نہیں ہوتی۔ یہ سب کچھ تو عقل کے منافی ہے۔ ڈائریکٹر نے مسکرا کر جواب دیا۔

"I make people to keep thier head under chairs

so they believe what I say."

ناصر کاظمی بھی کچھ ایسا ہی گر جانتے تھے۔ وہ اپنی بات کو پر یقین بنانے کا فن جانتے تھے اسلوب کے دھاگے سیدھے کر کے وہ گفتگو کا تانا بانا بنانا جانتے تھے۔ ان کے جانے کے بعد سننے والا ان کے سحر سے باہر نہیں نکل سکتا تھا اور دوبارہ ناصر کاظمی کا منتظر رہتا تھا۔ ناصر کاظمی کی گفتگو دراصل وائٹ پوڈر کی طرح تھی جو اس نشے کا عادی ہو جاتا وہ کہیں کا نہ رہتا۔

انگریزی شاعر شیلے (Shelly) جب اپنی زندگی کے بدترین دور سے گزر رہا تھا تو اس نے اپنی مشہور نظم (Queen Mab) لکھی۔ لندن کی اداس راتیں شیلے اور آوارہ گردی۔ اس زمانے میں نوزائیدہ بچوں کو گود میں بٹھا کر پوچھا کرتا تھا کہ تم اوپر سے آئے ہو سناؤ وہاں سقراط اور افلاطون سے ملے ہو۔ برف باری میں شاخ پر بیٹھی اکیلی فاختہ کا دکھ محسوس کر کے روتا تھا۔ پرندوں کو پنجروں میں دیکھ کر کڑھتا تھا اور پنجرے کھول کر آزاد کرا دیتا تھا۔ ناصر کاظمی کی کیفیت بھی یہی تھی لاہور کی ویران سڑکوں پر رات ڈھلے چوکیدار دھواں اور ناصر کاظمی کے علاوہ کوئی نہ ہوتا تھا۔ وہ تھکے راستوں کی نبض ٹٹول کر ان راستوں سے گزرنے والوں کے دکھ جاننا چاہتا تھا۔ لارنس باغ کے کسی درخت کی شاخ پر بیٹھی فاختہ کو دیکھ کر بڑبڑاتا تھا۔

فاختہ دیر سے چپ بیٹھی ہے
سرو کی شاخ ہلا کر دیکھو

کہتے ہیں بچپن میں شیلے (Shelly) خود پر تیل چھڑک کر اور آگ لگا کر اپنی بہن سے کہتا تھا۔

Let us play Hell

اور پھر بند کمرے میں روحوں کو بلا کر ان سے گفتگو کرنے کا عادی تھا۔ ناصر کاظمی جب گورنمنٹ کالج میں داخل ہوئے تو ہاسٹل میں قیام کیا تھا۔ صوفی تبسم ہاسٹل کے انچارج تھے۔ انہی بتلایا گیا

کہ انبالہ سے ایک لڑکا آیا ہے جو بند کمرے میں شیکسپیئر اور غالب کی روح کو بلا کر اس سے گفتگو کرتا ہے۔ صوفی صاحب نے خود جا کر یہ سین دیکھا اور پھر بقول صوفی صاحب انہوں نے یہ منظر پطرس بخاری کو بھی دکھایا۔ صوفی صاحب کہتے تھے کہ جب میں پطرس بخاری کو لے کر ناصر کاظمی کے کمرے کی کھڑکی کے پاس پہنچا تو وہ کرسی پر بیٹھا سامنے دیوار پر بنی ایک ہیولہ نما تصویر سے انگریزی میں باتیں کر رہا تھا۔ بخاری صاحب نے بتلایا کہ یہ ہملٹ کے ڈائیلاگ ہیں۔

روحانی یا ان دیکھی کیفیتوں کے ہیولے اکثر ناصر کاظمی کی آنکھوں میں سرگوشیاں کرتے نظر آتے تھے۔ گفتگو کرتے کرتے غائب ہو جانا۔ محفل میں بیٹھ کر اکیلا پن محسوس کرنا۔ چلتے چلتے ہاتھ ملا کر کسی گلی میں غائب ہو جانا۔ آشنائی کے باوجود پہچاننے سے انکار کرنا۔ یہ سب حرکتیں کرنے والے ناصر کاظمی نہ تھے بلکہ ان کے اندر بیٹھی وہ طاقت تھی جو صرف ناصر کاظمی کو جانتی تھی اور صرف اس سے ملنا چاہتی تھی۔ شاید اسی لئے وہ اچانک ہاتھ ملا کر ساتھ چلنے والے کو اکیلا چھوڑ کر کسی گلی میں گم ہو جاتے تھے۔ ایک بار میں مسلسل ان کے پاس ۱۲ بجے سے لے کر چار بجے شام تک بیٹھا رہا۔ ۴ بجے انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

''تم بیٹھے ہو؟''

''ہاں اکیلا بیٹھا ہوں۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''اکیلا رہنے کی مشق کرو۔ دوسرا آدمی ساتھ ہو تو نروان نہیں ہوتا۔'' ناصر کاظمی بولے۔

زندگی کے لق و دق صحرا کی خاک چھانتے ایک عمر بیت گئی مگر تجربہ کی چھاننی میں سوائے کنکروں اور سنگریزوں کے کچھ نہیں۔ نہ فکر کی رات میں کوئی ستارہ چمکا نہ شعور نے کروٹ بدل کے بیدار ہونے کا اعلان کیا۔ لفظ ذہن کے جنگل میں ہنہناتے پھرتے ہیں۔ دیکھتا رہتا ہوں لیکن ان کی پشت پر کاٹھی ڈالنے کا فن نہیں آیا۔ یہی فن سیکھنے کے لئے سجاد باقر رضوی اور ناصر کاظمی کی چوکھٹ پر بوسہ دیا۔

سجاد باقر رضوی نے ہمیشہ کہا ''پڑھا کرو۔'' مگر علم سے آشنائی نہ ہوئی۔ رات کی آوارہ گردی ہو یا دن کی محفل ناصر کاظمی ہمیشہ کہا کرتے تھے۔

''عقیل روبی! کچھ نہ کچھ کرتے رہا کرو۔ یہ نہ سوچا کرو کہ اس کام کا جو کر رہے ہو فائدہ کیا ہے۔ کام کرو اور مکمل کر کے رکھ چھوڑو۔ کسی نہ کسی دن کوئی نہ کوئی آئے گا اور تمہارے کام کی بولی لگا دے گا۔''

میں نے زندگی میں کوئی تیر نہیں مارا لیکن اگر کچھ اتفاق سے ہو گیا ہے تو یہ سب ان کی صحبت کا نتیجہ ہے۔ ناصر کاظمی نے اپنی کوئی کمزوری کوئی خامی میری جھولی میں نہیں ڈالی۔ رات کو دیر تک جاگنے کی عادت میں نے خود سنت ناصر کاظمی سمجھ کر اپنائی ہے۔ انہوں نے ہمیشہ میرے جیسے نوجوانوں کی ہلکی سی خوبی کو بے حد سراہا اور اندر چھپی صلاحیت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ان کے بیٹے باصر سلطان اور حسن جب میں ایم اے کر رہا تھا تو بہت چھوٹے چھوٹے تھے۔ میں گھر جاتا تو وہ انہیں بلا کر کہتے۔

''سلام کرو عقیل روبی کو اور اس کی طرح محنت کیا کرو''۔

ناصر کاظمی گھر بہت دیر میں جاتے تھے کبھی کبھی میں انہیں گھر چھوڑ کر آتا تھا۔ جس دن میں ساتھ ہوتا تو دروازے پر دستک بہت زور سے دیتے تھے۔ جب تک دروازہ نہ کھلتا کچھ نہ کچھ گنگناتے رہتے۔ مجھے دیکھ کر کہتے۔

''تم ساتھ ہوتے ہو تو گھر میں داخلہ آسان ہو جاتا ہے۔''

''کیوں؟''

''تمہاری اور احمد مشتاق کی Reputation گھر میں بہت اچھی ہے۔ میں بیوی سے کہوں کہ عقیل روبی آئے ہیں تو بہت اچھی چائے اور گرم کھانا ملتا ہے۔''

ناصر کاظمی بیوی کی بہت تعریف کرتے تھے۔ اگرچہ بیویوں کے بارے میں ان کی رائے کبھی کبھی منفی بھی ہوتی تھی۔ ایک بار ٹی ہاؤس میں کسی نے جلدی جانے کا بہانہ بناتے ہوئے کہا۔

''میری بیوی بیمار ہے میں چلا''

ناصر کاظمی کہنے لگے۔

''چھوڑو یار بیوی تو ازل سے بیمار چلی آ رہی ہے۔ سسرال کا کوئی رشتے دار جائے تو بیمار۔ میکے سے رشتے داروں کی ڈار چلی آئے تو بھلی چنگی۔ بیماری کتنی ہی خطرناک کیوں نہ ہو۔ انارکلی جانے کا پروگرام بنالو فوراً کپڑے بدل کر تیار ہو جائے گی''۔

لیکن جب اپنی بیوی کی بات کرتے تو بہت سنبھل کر۔ اکثر کہا کرتے تھے۔

''میں بہت مشکل فضول اور بے کار آدمی ہوں۔ میرے ساتھ گرم سرد عذاب سہنے والی عورت عورت نہیں ولی ہے۔''

ناصر کاظمی کا بچپن اور جوانی انبالے کے کھاتے پیتے گھرانے میں گزرا تھا۔ ان کی مبالغہ آرائی کو اگر سچائی پر تقسیم کیا جائے تو حاصل تقسیم یہ نکلتا ہے کہ اگر وہ سونے کا نہیں تو چاندی کا چمچہ لے کر ضرور پیدا ہوئے تھے۔ گھوڑے، کتے، پرندے، حویلی، کھیت، نوکر انہیں سب کچھ حاصل تھا لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد سب کچھ بکھر گیا۔ میں کئی سال سردیوں میں انہیں ایک Brown

کوٹ میں ہی دیکھتا رہا۔ میں نے ایک دن رواروی میں کہا۔

''آپ کا یہ کوٹ سٹالن کے کوٹ کی طرح تاریخی ہے۔ ۲۵ سال اس نے ایک اوور کوٹ میں گزارے اسی کو پہنتا تھا اسی کو اوپر اوڑھ کر لیٹ جاتا تھا۔''

''اس کا کوٹ واقعی سمجھدار تھا ۲۵ سال ساتھ دیا مگر سٹالن بے وقوف آدمی تھا۔ عین سالگرہ کے دن بیوی کو پستول کا تحفہ دے کر خودکشی کرنے کا مشورہ دے دیا۔''

''خروشیف کے نام اس کا رومانی خط جو پکڑا گیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''اس چوری کا انکشاف کسی اور دن کر دیا ہوتا سالگرہ کے دن خوشیوں کو دھواں دھار ضرور کرنا تھا۔''

ناصر کاظمی نے اپنی فکر کبھی نہیں کی۔ قینچی کا سگریٹ پی کر ٹی ہاؤس کے سامنے بوہڑ کے درخت کے نیچے لگے نل سے منہ دھو کر خوش ہو جاتے تھے۔ دایاں ہاتھ بغل میں دبا کر اور سگریٹ کا کش لے کر سمجھتے تھے پوری کائنات ان کے تصرف میں ہے۔ لیکن گھر والوں اور قریبی دوستوں کے بارے میں ہمیشہ فکرمند رہتے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی عنصر کاظمی A.G آفس میں کلرک تھے۔ ایک بار عید سے کچھ دن پہلے بہت مغموم اور اداس تھے۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے۔

''میں نے بہت اچھا کھایا اور اچھا پہنا ہے۔ عنصر کو دیکھ کر دل کڑھتا ہے۔ اس نے کچھ بھی تو نہیں دیکھا۔ میں بھی کیسا فضول بھائی اور بیکار باپ ہوں۔ عید سر پر ہے نہ عنصر کے لئے سوٹ بنوا سکا نہ باصر اور حسن کے لئے جوتیاں خرید سکا۔''

پھر رک کر کہنے لگے۔

''عقیل روبی! یہ دولت بھی کتنی فضول عورت ہے۔ اس کے پیچھے بھاگو تو یہ آگے دوڑتی ہے۔ اس سے دور بھاگو تو یہ پیچھے آتی ہے۔''

''تو آپ اس سے دور بھاگیے۔''

''کئی بار بھاگا ہوں مگر یہ سالی کسی اور ہی کے پیچھے چلی جاتی ہے۔ Damn Fool" Idiot

اور پھر اپنا شعر ترنم میں گنگنانے لگے۔

وقت اچھا بھی آئے گا ناصر
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

عورت اور شاعر میں ایک مماثلت مشترک ہے ۔عورت شادی کے چند ماہ بعد چھوٹے چھوٹے فراک اور Napes بنا کر آنے والے بچے کے استقبال کی تیاریاں شروع کر دیتی ہے اور شاعر چند غزلیں لکھ کر دیوان بنانے اور چھاپنے کا منصوبہ بنانا شروع کر دیتا ہے۔ بہاولپور میں رہ کے میں نے بہت سی نظمیں اور غزلیں کہہ لی تھیں ۔یہ کانٹے دن رات چبھنے لگے۔ تکلیف شروع ہوئی ۔علاج سوچا تو ایک ہی بات سمجھ میں آئی کہ دیوان چھاپا جائے ۔خیر اچھی بری غزلیں نظمیں اکٹھی کیں ۔انہیں کتابت کرایا اور ڈمی بنا کر لاہور چلا آیا۔خواہش یہ تھی کہ باقر صاحب دیباچہ اور ناصر کاظمی اس کا فلیپ لکھیں۔

سجاد باقر رضوی کے پاس مسودہ لے کر گیا۔ بہت لے دے ہوئی ۔ان کی باتیں سنیں ۔میں نے کہا یہ سب کچھ دیباچے میں لکھ دیں ۔انہوں نے دیباچہ لکھ دیا اور پھر میں سب کچھ لفافے میں ڈال کر ناصر کاظمی کے پاس ریڈیو سٹیشن چلا آیا۔ بھاری خاکی لفافہ میرے ہاتھ میں دیکھ کر کہنے لگے۔

''اس میں کیا ہے؟''

میں نے بڑی ہمت سے جواب دیا۔

''کتاب کا مسودہ ہے۔''

''کس کی کتاب کا؟''

''اپنی''

''good تو پھر چھپوا دو''

''اسی لئے تو آپ کے پاس آیا ہوں۔''

''میرے پاس کس لئے آئے ہو؟'' ناصر بولے۔

''آپ سے اس کتاب پر کچھ لکھوانا ہے۔''

''نہیں بھائی میں یہ کام نہیں کروں گا۔ یہ کام تو پڑھے لکھے پروفیسروں کا ہے۔ شعر اور شاعر کا وہی تجزیہ کر سکتے ہیں۔'' اس کے بعد انہوں نے پروفیسروں کی ذہانت پر ایک طنزیہ لیکچر جھاڑ دیا اور پھر کہنے لگے۔

''سجاد باقر رضوی بہت پڑھا لکھا آدمی ہے اس سے لکھوالو۔''

''انہوں نے دیباچہ لکھ دیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''تو بس کافی ہے۔''

''نہیں کافی نہیں آپ فلیپ لکھیں۔'' میں نے ضد کی۔'' آپ کا فلیپ نہیں ہو گا تو کتاب نہیں چھپے گی۔''

ناصر کاظمی فوراً بولے

''مارے گئے۔ چلو ٹھیک ہے۔ لیکن میری ایک شرط ہے۔''

''کیا شرط ہے آپ کی۔'' میں نے پوچھا۔

''میں کتاب پڑھوں گا۔ شروع سے لے کر آخر تک۔ اگر پسند نہ آئی تو میں نہیں لکھوں گا فلیپ۔'' ناصر کاظمی نے دوٹوک بات کی۔

''یہ بات طے کر کے میں اور ناصر ریڈیو پاکستان سے باہر نکلے۔ وہ رات دس بجے تک ٹی ہاؤس رہے۔ وہاں سے اٹھے۔ ۲ بجے تک ادھر ادھر گھومتے رہے۔ اڑھائی بجے گھر پہنچے۔ مجھے کمرے میں بٹھا کر خود چلے گئے۔ کھانا کھایا چائے پی حقہ سامنے رکھا کمبل اپنے ارد گرد لپیٹ کر چارپائی پر اکڑوں بیٹھ گئے اور میری کتاب کا مسودہ کھول کر سامنے رکھ لیا۔ ایک ایک لفظ اور شعر کی جانچ پڑتال کی اور پھر ایک غزل کے ایک شعر پر آ کر رک گئے اور چونک کر بولے۔

''مارے گئے۔''

"کیوں کیا ہوا؟ ناصر بھائی!"

"تم نے یہ میرا پورے کا پورا شعر اپنی غزل میں لکھ دیا۔"

میں نے کہا

"ہوسکتا ہے۔ آپ کو اتنا پڑھا ہے اتنا اثر ہے آپ کا۔"

"پھر کیا کریں۔" ناصر بولے۔

"اسے کاٹ دیں۔"

"نہیں مجھے اپنی ڈائری میں دیکھ لینے دو۔ کہیں مجھے غلطی نہ لگ رہی ہو۔"

ناصر کاظمی نے اپنی الماری سے ڈائریاں نکالنا شروع کیں۔

ناصر کاظمی کی مشہور غزل

میں ہوں رات کا ایک بجا ہے

سونا رستہ بول رہا ہے

اس زمانے میں بے حد مقبول ہوئی۔ کوئی شاعر ہوگا جس نے اس زمین اور ردیف قافیہ میں غزل نہ کہی ہو۔ میں نے بھی اسی زمین میں غزل کہی تھی۔

یاد نے پھر پہلو بدلا ہے

ایک نیا دکھ جاگ اٹھا ہے

اور جس شعر پر ناصر کو اپنے شعر کا شک تھا وہ یہ تھا

رات کے کڑیل دروازے پر

خاموشی کا قفل پڑا ہے

ناصر کاظمی اپنی کاپیاں دیکھتے رہے۔ میں نے ایک ڈائری کی طرف ہاتھ بڑھایا

"میں بھی تلاش کروں۔"

"ہاں ہاں دیکھو۔" ناصر بولے۔

میں نے ڈائری کی ورق گردانی شروع کی۔ اس میں غزلیں کم اور نثری جملے اور روز

مرہ کی تفصیل زیادہ تھی۔ ایک ورق پر دو تین جملوں کو سرخ پنسل کا دائرہ لگا کر لکھا گیا تھا اور جملوں میں میرا نام لکھا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا تو لکھا تھا۔

''مولیٰ حسین'' آج میں نے عقیل روبی سے ۲۰ روپے لئے ہیں میں واپس نہیں کروں گا تو اسے ۲۰ لاکھ روپے دے دینا۔''

غالباً یہ وہ ۲۰ روپے تھے جو ناصر نے امانت علی خان کے ساتھ ہاسٹل آ کر مجھ سے لئے تھے۔ میری آنکھوں میں پانی کی ایک لہر سی تیر گئی۔ ناصر کاظمی نے مجھے دیکھا۔ ڈائری کے ورق پر نظر پڑی اور ڈائری مجھ سے لے لی اور پھر اسے بند کر کے کہنے لگے۔

''تم سے چھپ کر مولیٰ حسینؑ سے تمہارے لئے ایک دعا مانگی تھی۔ آخر تم نے سن ہی لی۔''

میں آبدیدہ نظروں سے ناصر بھائی کو دیکھتا رہا اور وہ کاپی کے ورق الٹتے رہے۔ آخر سب کاپیاں دیکھ کر کہنے لگے۔

''نہیں ملا۔ یہ شعر میرا نہیں تمہارا ہے۔''

سگریٹ سلگائی اور کہنے لگے۔

''چلو اٹھو کبوتروں کو دانہ ڈالنے کا وقت ہو گیا ہے۔''

اور مجھے لے کر چھت پر آ گئے۔ صبح طلوع ہو چکی تھی۔ کرشن نگر کی چھتوں پر ابھی ہلکی ہلکی تاریکی تھی۔ ناصر نے کبوتروں کو ڈربوں سے باہر نکالا۔ ان سے گفتگو کی اور پھر میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے۔

''تمہارے شعر پر مجھے اپنے شعر کا گمان ہو گیا۔ اب تمہارے شاعر ہونے میں کیا شک ہے۔ میں تمہاری کتاب کا فلیپ لکھوں گا۔''

ناصر کاظمی انبالہ میں پیدا ہوئے۔ انگریزی شاعر وڈز ورتھ کی طرح ان کا سارا بچپن نوکر چاکر، گھوڑے، کبوتر، کھیت کھلیان، ناز برداریوں، حویلی، شکار، رشتے دار، ان کے گھر ساری عمر ان کی یادداشت میں محفوظ رہے ورڈز ورتھ نے یہ سب کچھ اپنی مشہور زمانہ نظم (PRELUDE) میں لکھ دیا۔ ناصر کاظمی ان یادداشتوں کو اپنی شاعری اور سحر انگیز گفتگو میں استعمال کرتے رہے۔ ورڈز ورتھ گھر اور اسکول سے بھاگنا۔ کشتی چرا کر باغ میں جانا۔ پھل چوری کرنا۔ مالی سے چھیڑ چھاڑ اپنی نظم میں بیان کرتا ہے۔ ناصر کاظمی بھی بڑے فخر سے کہا کرتے تھے۔

''میں کبھی پورا دن سکول میں نہیں بیٹھا۔ بس جب ماسٹر حاضری لگا لیتے۔ میں اپنے دوست افتخار کو ساتھ لے کر دیوار پھلانگتا اور باغ میں چلا جاتا۔ بس پھر کیا، وہ میں، بیر اور امرود کے درخت اور مالی سے آنکھ مچولی۔ کبھی اس سے پٹے اور کبھی اسے پیٹا۔''

ناصر کاظمی نے خزاں اور بہار کے مناظر اسی عمر میں اکٹھے کیے۔ پتوں کی پازیب، گھاس کی سبز چادر، سوکھے پتوں کا ڈھیر، گیت بنتی ہوئی ہوا، اداس فاختہ کی خاموشی، سایہ گل، سرو کی شاخ۔ یہ سب کچھ ناصر کاظمی نے یادداشت کی گٹھری میں اسی زمانے میں باندھا تھا۔

ناصر کاظمی نے سورج کو درختوں کے جھنڈ کے پیچھے گرتے اور چاند کو اسی جگہ سے سر نکالتے ہوئے دیکھا۔ فطرے کے اس قرب نے انہیں ساری عمر بے تاب رکھا اور وہ ساری عمر یادوں کی گرم اینٹوں پر پاؤں سہلاتے ہوئے پھرتے رہے۔

ناصر کاظمی کا بچپن کئی لحاظ سے شیلے (SHELLY) کا بچپن ہے۔ اس کی عجیب و

غریب حرکات نے گھر والوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ کئی بار اس نے کپڑوں پر تیل اور تیزاب چھڑک کر خود کو آگ لگانے کی کوشش کی تا کہ اپنی بہن سے ''جہنم جہنم'' کھیل سکے۔ ناصر کاظمی نے تیزاب اور مٹی کے تیل کی دو بوتلوں کو توڑ کر نہ جانے دیوار میں گاڑھ کر کیا کرتب اور کیا کہ ایک بلب روشن کر دیا۔ اور تو اور دیوالی کے روز دوستوں کی پرزور سفارش پر دو بم بنا دیئے۔ ایک انبالہ کے کمشنر کے گھر پھینک دیا جو چلا نہیں۔ ایک قبرستان میں پھینک دیا جو چل گیا۔ بقول ناصر کاظمی یہ بھی شاعری ہے وہ کہتے تھے کہ دنیا کا ہر آدمی شاعر ہے کیونکہ اسے پتہ ہے کہ کون سا کام کیسے کرنا اور کب کرنا ہے۔ (بم بنانے کی تصدیق ان کی خالہ صغرا بی بی نے بھی کی)

ناصر کاظمی کا بچپن بڑی شان اور ٹھاٹ باٹ میں گزرا۔ ان کے والد فوج میں تھے۔ بہت سے علاقوں کی سیر کی۔ نوکر آگے پیچھے جس کو جو کہا پورا ہوا۔ مرضی کے خلاف بات ہوئی تو بگڑ گئے۔ ایک بار ایک ڈاکٹر ان کا علاج کرنے آیا تو اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ جب وہ یہ بات سنا رہے تھے تو کسی نے کہا'' کیوں مارا آپ نے یہ تھپڑ''

''میں بہت لاڈلا تھا۔ اس لئے بہت بدتمیز تھا۔ وہ میری ایک پھنسی کا آپریشن کرنے آیا تھا۔ میں نے اسے تھپڑ مار دیا۔ بہت شریف آدمی تھا وہ تھپڑ کھا کر کہنے لگا۔ ''بہادر لڑکا ہے یہ''

اپنے خوشحال امیر اور صاحب ثروت ہونے کا احساس ناصر کاظمی کو تمام عمر رہا۔ ہجرت کے بعد وہ لاہور آ گئے۔ جو سونا چاندی گھر والے چھپا کر لائے تھے۔ جب وہ سب کا سب سنار کی تجوری میں چلا گیا۔ تب بھی خاندانی شرافت اور وقار میلا نہ پڑا۔ خواجہ میر درد کی طرح فاقے کئے مگر انا کی چار دیواری سے باہر آ کر کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلایا۔ سر اٹھا کر سینہ تان کر شان سے چلتے رہے جھک کر لوگوں کو یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ معدہ خالی ہے بلکہ بے سروسامانی میں بھی دوسروں کی مکمل خبر گیری کرتے رہے۔ ۱۹۶۴ء کا زمانہ خوشحالی کا زمانہ نہ تھا لیکن اس میں بھی انہیں دوسروں کی فکر رہی۔ انوار انجم کی چھٹی رضائی۔ اور میری (Payslip) نہ بھولی۔ خود پہ نہ جانے کیا بیتی لیکن میرے لئے کہیں نہ کہیں سے سو روپے کا نوٹ ڈھونڈ ہی نکالا۔ خود قینچی کی سگریٹ پیتے تھے لیکن جب خوش ہوتے تو ہمارے لئے تھری کاسل کی ڈبیہ خریدتے تھے۔

دراصل اس محبت اور ایثار کے پیچھے ایک جذبہ یہ بھی کارفرما تھا کہ میں چھوٹا آدمی نہیں۔ میں نے اچھے دن دیکھے ہیں۔ میں اب بھی طاقتور ہوں۔ یہ ثابت کرنے کے لئے وہ ایک دلیل یہ دیتے تھے کہ سارے C.S.P اور P.C.S افسر میرے دوست ہیں۔ فوج میں میرے ہزاروں آشنا اور مداح ہیں کسی کیپٹن یا میجر سے تعارف ہوتا تو شانے پر ہاتھ رکھ کر کہتے۔

''گڈ تمہاری طرح میرے کئی دوست فوج میں ہیں۔'' مقررہ وقت پر اگر نہ پہنچے تو دیر میں آنے کا بہانہ اکثر یہ بناتے تھے۔

''میں بس آ رہا تھا۔ کہ فلاں میجر فلاں ڈپٹی کمشنر گاڑی لے کر آ گیا۔ بس اس کے ساتھ کھانا کھانے ہوٹل چلا گیا تھا۔ میں حیران ہوں۔ اسے میرے اتنے شعر یاد ہیں''۔

ایک بار ارشاد حسین کاظمی نے ناصر کاظمی سے کہا۔

''ناصر بھائی اگر ملٹری میں آپ کے اتنے بیٹے اور مداح ہیں تو آپ مارشل لاء نافذ کرا کے صدر کیوں نہیں بن جاتے۔''

ناصر کاظمی نے مسکرا کر کہا

''یہ صدارت نہیں ذلت ہوگی۔ روٹی وہ جو آدمی خود کما کر کھائے۔'' جب ارشاد کاظمی چلا گیا تو کہنے لگے۔

''ابھی کل سیالکوٹ سے آیا ہے اور ہماری باتوں پر شک کرتا ہے۔ میں ابھی میاں افتخار الدین سے بات کرتا ہوں۔''

ارشاد حسین کاظمی ۱۹۶۴ء میں یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ راحت نسیم ملک محمود شام کشور ناہید کے ساتھ زیادہ اٹھنا بیٹھنا تھا۔ یونیورسٹی میں کئی سال سے ایک ہی کلاس میں چلا آ رہا تھا۔ سیالکوٹ کا رہنے والا۔ خوبصورت شاعر فقرے باز۔ چلتا تھا تو ساتھ والے کے شانوں پر پورا بوجھ ڈال کر۔

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم ہفت روزہ ''لیل و نہار'' کے ایڈیٹر تھے۔ ارشاد ان کے ساتھ تھا۔ ''لیل و نہار'' پروگریسو پیپرز کا رسالہ تھا جس کے مالک میاں افتخار الدین تھے، ٹی ہاؤس، کافی

ہاؤس، یونیورسٹی کیفے ٹیریا میں ارشاد حسین کاظمی کا طوطی بولتا تھا۔ ''لیل ونہار'' میں مہینے میں ایک بار میری غزل یا نظم چھاپتا۔ ۱۵ روپے کا چک دلاتا۔ اس زمانے میں ۱۵ روپے اتنی بڑی رقم تھی کہ آدمی آدھا لاہور گھوم لے اور ہفتہ گھومتا رہے مگر رقم ختم نہ ہو۔ ارشاد ناصر کاظمی پر جملے چھوڑتا رہتا تھا لیکن ناصر کاظمی کی شاعری کا سب سے بڑا مداح اور پرچارک۔ جب کوئی جملہ ناصر کو برا لگتا تو وہ میاں افتخار الدین کو فون کرنا نہ بھولتے اور مزے کی بات ہے کہ فون کبھی نہیں کیا بلکہ دیکھنے والوں نے اکثر دیکھا کہ وہ پندرہ منٹ بعد ارشاد حسین کاظمی کے ساتھ بیٹھے چائے پی رہے ہیں۔

ناصر کاظمی اپنے Mood کے آدمی تھے۔انہیں تبدیل ہوتے دیر نہ لگتی تھی۔ایک لمحے شناسائی۔دوسرے لمحے اجنبیت۔کبھی کبھی تو بیزاری کی انتہا کر دیتے تھے۔دن بھر کا ساتھ ایک پل میں توڑ کر یہ جا وہ جا۔دیکھنے سننے والا منہ دیکھتا رہ جاتا تھا۔اپنی دنیا میں افلاطون کی طرح اپنی پسند کے آدمی کو داخل ہونے دیتے تھے اور اگر وہ اچھا نہ لگا تو فورا باہر نکال دیتے تھے۔کسی موڑ پر اچانک رک کر ہاتھ ملاتے اور کہتے۔

''اچھا خدا حافظ'' اور چند لمحوں میں غائب۔ان کے یہ بدلتے Moods ان کی شخصیت کا دلچسپ عناصر تھے۔ریڈیو پاکستان لاہور میں وہ سٹاف آرٹسٹ تھے''سفینہ غزل'' لکھ رہے تھے۔ان کے کمرے میں میرے علاوہ دوسرا ان کے ساتھ کوئی نہ تھا۔سر جھکا کر لکھ رہے تھے۔۲ گھنٹے میں بیٹھا رہا۔کوئی بات نہ کی۔اچانک دروازہ کھلا اور فریدہ خانم اندر داخل ہوئیں۔گلابی ساڑھی میں ملبوس فریدہ خانم سراپا پری دکھائی دے رہی تھیں۔ان کی کلائی چوڑیوں سے بھری ہوتی تھی۔1964ء کی فریدہ خانم اپنی مثال آپ تھیں فریدہ نے اپنا ہاتھ بال درست کر کے جب نیچے گرایا تو چوڑیوں کا چھنا کا پورے کمرے میں گونج گیا۔۲ گھنٹے کی خاموشی کرچی کرچی ہو کر بکھر گئی۔سارا کمرہ ناصر کاظمی کے سوا گنگنانے لگا۔ناصر نے گردن اٹھا کر فرید خانم کی طرف دیکھا وہ مسکرائی۔مگر ناصر کاظمی کے چہرے پر اکتاہٹ تھی۔

فریدہ خانم نے کہا''میں نے ڈسٹرب کیا آپ کو''

''ہاں''

فریدہ خانم نے زوردار قہقہہ لگا کر کہا۔

''کیسے شاعر ہو تم ناصر کاظمی۔ شاعر تو چوڑیوں کی اس آواز پر پاگل ہو جاتے ہیں۔''

''ہو جاتے ہونگے۔ مگر میں شاعروں کے اس قبیلے میں سے نہیں مجھے اپنی تنہائی چوڑیوں کے اس چھناکے سے زیادہ عزیز ہے۔''

فریدہ یہ بات سن کر مسکرائی اور باہر چلی گئی۔

لاہور کا رائل پارک فلمی دفتروں اور فلمی شخصیتوں کا گڑھ ہے اور تھا۔ ۱۹۶۴ء میں ہر بڑا اداکار اور ڈائریکٹر یہاں آتا تھا۔ میں لاہور میں آیا تو چند ماہ آرٹسٹ موجد کے ایک چھوٹے دفتر میں گزارے جس کو موجد نہیں استعمال کرتے تھے قتیل شفائی کے استعمال میں تھا۔ میرا ہاسٹل کا بندوبست نہ ہوا تو قتیل شفائی نے مجھے یہاں قیام کرنے کے لئے کہا۔ چنانچہ میں نے وہاں ڈیرے ڈال دیئے۔ ایک دن میں شام کو یوں ہی بے مقصد گھوم رہا تھا کہ میری ملاقات موسیقار بابا جی۔ اے چشتی سے ہوگئی۔ ان کے ہاتھ میں سینما کے دو ٹکٹ تھے۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگے۔

''اچھا ہوا تم مل گئے۔ میں نے انگریزی فلم کے دو ٹکٹ خریدے تھے۔ مگر میری فلم کا آج بیک گراؤنڈ میوزک ہے۔ لو یہ ٹکٹ اور عیش کرو۔'' اور ٹکٹوں کے ساتھ پچاس روپے کا ایک نوٹ بھی دے دیا۔

''یہ کس لئے''

''انٹرول میں کچھ کھا پی لینا''۔

میں دو ٹکٹ ہاتھ میں لے کر سوچنے لگا۔ دوسرا آدمی کونسا ساتھ لوں۔ ٹی ہاؤس پہنچا تو ناصر کاظمی باہر کھڑے تھے۔ میں نے قریب جا کر سلام کیا۔

''کیا حال ہیں'' وہ بولے

''حال اچھا ہے۔ آیئے فلم دیکھنے چلیں۔''

''کون سی فلم ہے'' ناصر کاظمی بولے۔

"Fearis The Key"۔ میں نے فلم کا نام بتلایا۔ اور پھر ٹکٹ ملنے کی ساری کہانی سنادی۔ وہ فلم دیکھنے پر رضا مند ہو گئے۔ غالباً پلازا میں فلم لگی تھی۔ ہال میں داخل ہوئے تو

ٹائٹل چل رہے تھے۔ ناصر میرے بائیں طرف بیٹھ گئے۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد میں نے دیکھا تو ناصر کاظمی غائب تھے۔ میں اٹھ کر باہر آیا تو ان کا کہیں پتہ نہ چلا ۔ میں ٹی ہاؤس واپس آ گیا۔ دیکھا تو وہ بیٹھے اکیلے چائے پی رہے تھے۔ میں پاس جا بیٹھا۔

''آپ اٹھ کر کیوں چلے آئے'' میں نے پوچھا۔

''فلم بہت اچھی تھی'' ناصر بولے۔

''تو پھر آپ چلے کیوں آئے۔''

''اس لئے کہ اچھی چیز کو کبھی مکمل نہیں دیکھنا چاہیئے۔'' ناصر کاظمی سگریٹ کا کش لیکر بولے۔ پھر کہنے لگے۔

''یہ بابا چشتی بہت اچھا آدمی ہے۔ شیروں سے بہت دوستی ہے اس کی''

''آپ کو کیسے پتہ چلا''

''ساحل فلم کی شوٹنگ میں ایک شیرنی کو لایا گیا تھا۔ اسے پنجرے میں بند کر کے فلور پر رکھا گیا تھا۔ ایک دن بابا چشتی رات کو اس کے پاس چلے گئے ۔ اور کہنے لگے ''بیٹی میں تیرے دکھ سے پوری طرح واقف ہوں ۔ میں زندگی کی قید کاٹ رہا ہوں ۔ اور تو انسان کی قید کاٹ رہی ہے۔'' اور پھر مسلسل رونے لگے۔ شیرنی بھی اشکبار ہو گئی۔

''یہ ممکن ہے'' میں نے پوچھا۔

''عین ممکن ہے'' ۔ ناصر کاظمی نے کہا۔ ''جب محرم کا چاند دکھائی دیتا ہے تو میرا شیرازی کبوتر رو رو کر مجھے کربلا کے واقعات سناتا ہے ۔ اس کا شجرہ نسب کبوتروں کے اس خاندان سے جا ملتا ہے ۔ جو خاندان کربلا میں حضرت امام حسین علیہ السلام کے ساتھ ہونے والے ظلم وستم کا چشم دید گواہ تھا۔'' پھر چند لمحوں کے لئے چپ ہو گئے ۔ اور کہنے لگے۔

''تاریخ صرف انسان نے کاغذوں پر محفوظ نہیں کی۔ پرندوں اور جانوروں کے سینوں میں بھی رقم ہے۔ صرف پڑھنے والی آنکھ چاہیے۔''

۱۹۷۰ء میں میں سلطان راہی کی فلم ''تقدیر کہاں لے آئی'' لکھ رہا تھا۔ یہ فلم نام کے

لحاظ سے فلم کے عملے کو بالکل راس نہ آئی۔ دیبا فلم کی ہیروئین تھی۔ اس پر اس کے پہلے خاوند نے مقدمہ کر دیا۔ سلطان راہی کی کار کے نیچے ایک آدمی آ گیا۔ ادیب کے ساتھ راہی کی لڑائی ہو گئی۔ حمید چوہدری ڈانس ڈائریکٹر کو انکم ٹیکس والے پکڑ کر لے گئے۔ میں نے سلطان راہی کو مشورہ دیا کہ خدا کے لئے فلم کا نام بدل دو لیکن اس سے پیشتر کہ فلم کا نام بدلا جاتا شاہ نور سٹوڈیو میں میرا ایکسڈنٹ ہو گیا اور ٹانگ ٹوٹ گئی اور مجھے یو۔سی۔ایچ ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ ہندوستان اور پاکستان کی جنگ جاری تھی۔ اس دوران مجھے ناصر کاظمی بہت یاد آئے۔ میں نے رقعہ بھیج کر انہیں ٹانگ ٹوٹنے کی اطلاع دی مگر دو ہفتے گزرنے کے بعد بھی وہ نہ آئے۔

ہفتے میں دو دن ڈاکٹر آصف مجھے آپریشن تھیٹر میں پٹی کے لئے بلواتے تھے۔ یو۔سی۔ ایچ میں آپریشن تھیٹر اوپر ہے۔ سیڑھیوں کے ساتھ ایک ڈھلوان راستہ بھی ہے جو نیچے سے اوپر جاتا ہے۔ یہ اسٹریچر کے لئے استعمال کیا جاتا ہے تا کہ مریضوں کو اوپر لے جایا جا سکے۔ مجھے اوپر لے جایا جا رہا تھا۔ نرس گھر والے میری والدہ ساتھ تھیں۔ مشہور فلمی سنگر نسیم بیگم سخت بیمار تھیں انہیں اس ہسپتال میں رکھا گیا تھا۔ فلمی اداکار انہیں دیکھنے کے لئے آتے جاتے تھے۔ اچانک شور مچا کہ نور جہاں اور محمد علی آئے ہیں۔ سارے لوگ مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ نرس نے میری والدہ کو اسٹریچر تھامنے کے لئے کہا میری والدہ نے اسٹریچر تھاما۔ اور نرس نور جہاں کو دیکھنے چلی گئی۔ میری ماں مجھے کہنے لگی۔

''کون آیا ہے۔''

''نور جہاں'' میں نے کہا۔

اور پھر وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

وہی جس نے گانا گایا ہے۔ ''آندھیاں غم کی یوں چلیں'' میری ماں کو یہ گانا بہت پسند تھا۔ وہ اس گیت کو میرے والد کی وفات اور ۱۹۴۷ء کے حادثہ کے پس منظر میں سنتی تھیں۔ نور جہاں کا نام سن کر انہوں نے اسٹریچر چھوڑ دیا۔ ہاتھ میں پکڑی تسبیح جیب میں ڈالی اور کہنے لگی۔

''میں نور جہاں کو دیکھ کر ابھی آئی'' اور ہجوم کی طرف چلی گئیں۔ میرے اسٹریچر نے

ڈھلوان کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ کوئی نہیں تھا۔ جسے روکنے کے لئے کہتا۔ میں نور جہاں کا Fan ہوں لیکن اس دن اس کی مقبولیت مجھے اچھی نہیں لگی۔ اسٹریچر تیزی سے نیچے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں پریشان تھا۔ میں نے پلاسٹر والی ٹانگ ذرا اوپر اٹھالی کہ اگر اسٹریچر دیوار سے ٹکرائے تو ٹانگ دیوار میں نہ لگے۔ اسٹریچر نیچے کی طرف دوڑا۔ اچانک نیچے سے آتے ہوئے کسی نے اسے تھام لیا۔ یہ ناصر کاظمی تھے۔

''اکیلے کہاں جا رہے ہو'' ناصر کاظمی نے پوچھا۔

''آپ کی طرف جا رہا تھا''۔ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

''سوری دیر ہوگئی'' ناصر کاظمی بولے

''نہیں آپ ٹھیک وقت پر آئے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''تم بالکل ٹھیک ٹھاک ہو۔ چہرہ ناک، کان، آنکھیں Good میں تو ڈر گیا تھا۔ کہ کہیں تمہارے چہرے پر لگے چشمے نے تمہارے ساتھ زیادتی نہ کی ہو۔''

اپنے سر پا ہاتھ پھیر کر کہنے لگے۔

''مجھے خوشی ہوئی تمہیں دیکھ کر تم نے حوصلہ نہیں ہارا''۔

''میں نے (Good bye Mr Chips) پڑھی ہے۔ سوچا دو نہیں تو ایک ٹانگ ہی سہی۔ کیا فرق پڑتا ہے'' میں نے ہنس کر کہا۔

''ہاں ٹھیک ہے۔ ادب سلیقے سے پڑھنے کا یہ فائدہ ہے۔ انسان میں ظاہری اور باطنی کیسی ہی ٹوٹ پھوٹ ہو۔ وہ حوصلہ نہیں ہارتا''

میری والدہ اور دوسرے لوگ نور جہاں کو دیکھ کر میری طرف آ رہے تھے۔ ناصر کاظمی کے چہرے پر پریشان سی جھلکی۔ میں نے پوچھا۔

''خیریت''

''ہاں۔ میں ماچس لیکر ابھی آیا۔ باہر رکشے میں بھول آیا ہوں۔'' وہ یہ کہہ کر چلے گئے ۔ میں مسکرایا مجھے سو فیصد یقین تھا۔ ماچس ان کی جیب میں تھی۔

ٹانگ کے حادثے نے مجھے ایک طویل عرصے تک گھر میں قید کئے رکھا۔ چھ ماہ تک جب ناصر کاظمی ماچس لے کر واپس نہ آئے تو ایک دن میں شام ڈھلے رکشہ لے کر ناصر کاظمی کو ڈھونڈنے گھر سے نکل پڑا۔ جن جن مقامات پر مجھے ناصر کاظمی کے پائے جانے کا گمان تھا وہاں وہاں تلاش کیا لیکن ناصر کاظمی نہ ملے۔ اسی جستجو اور تلاش میں رات کے 8 بج گئے۔ ان کا آخری ٹھکانہ گھر تھا مجھے وہ وہاں بھی نہیں ملے۔ رکشے والا بھی 3 گھنٹے سے اس منزل کی تلاش میں میرے ساتھ تھا۔ سگریٹ والی ایک دکان سے میں نے سگریٹ خریدے تو باقی پیسے میری ہتھیلی پر رکھ کر کہنے لگا۔

''یہ کون ہیں جنہیں آپ تلاش کر رہے ہیں۔''

''ناصر کاظمی''

''کون ہیں یہ''

میں نے ہنس کر جواب دیا۔

''اگر تمہیں پتہ ہوتا تو تم مجھ سے پوچھتے نہ۔ بس تلاش کرتے رہتے۔''

رکشے والے نے رکشہ سٹارٹ کیا اور رکشے کی آواز کے شور میں ہنس کر کہنے لگا۔

''اگر یہ کوئی خوبصورت عورت ہیں تو آپ کی تلاش ٹھیک ہے ورنہ آپ کے دماغ میں کوئی خرابی ہے۔''

میں نے اسکی آواز سن لی تھی۔ میں نے ہنس کر جواب دیا۔

''دماغ کی اِسی خرابی کا علاج ڈھونڈنے کے لئے تو انہیں تلاش کر رہا ہوں۔''

چند دنوں بعد ناصر کاظمی گھومتے پھرتے میرے پاس لبرٹی والے فلیٹ میں جہاں میرا قیام تھا آ گئے اور کہنے لگے۔

''سنا ہے ایک شام تم نے مجھے بہت تلاش کیا''۔

''جی مگر آپ کو کس نے بتلایا''

دونوں ہاتھ مل کر اپنے چہرے پر پھیرنے کے بعد انہوں نے سگریٹ نکال کر سلگائی اور کش لے کر بولے میں ٹی۔ ہاؤس گیا تھا۔ الٰہی بخش بتلا رہا تھا مجھے''۔

''ٹھیک بتایا اس نے۔ میں نے آپ کو بہت ڈھونڈا مگر آپ سے ملاقات نہیں ہو سکی''۔

ناصر کاظمی نے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔

''کبھی کبھی زندگی بھر ملاقات نہیں ہوتی۔ بس آدمی ڈھونڈتا ہی رہتا ہے۔''

میں حیرانی میں اُن کا منہ دیکھتا رہا۔ ناصر کاظمی نے سامنے رکھی چائے کی پیالی میں سگریٹ کی راکھ جھاڑ کر کہا۔

''ویسے تم بہت بے وقوف ہو''

''کیوں ناصر بھائی۔ کیا تازہ حماقت ہوئی مجھ سے''

''تم نے یہ موٹر سائیکل کیوں خریدی''

''آنے جانے میں بہت مشکل پیش آتی تھی''

ناصر کاظمی نے مجھے مسکرا کر دیکھا اور کہنے لگے۔

''ٹھیک ہے اگر خرید ہی لی تھی تو موٹر سائیکل اتنی تیز چلانے کی کیا ضرورت تھی۔ خواہ مخواہ ٹانگ تڑوا بیٹھے۔''

میں نے فوراً صفائی پیش کی۔

''میں موٹر سائیکل تیز بالکل نہیں چلا رہا تھا۔ میں کھڑا تھا اچانک گاڑی آ کر مجھ سے ٹکرا گئی۔

''یہ تمہاری دوسری حماقت ہے۔'' ناصر کاظمی نے کہا

''اگر موٹر گاڑی تمہاری طرف آ رہی تھی۔تم بھی چل دیتے''

''تیز رفتار گاڑی نے مجھے موقعہ ہی نہیں دیا۔''

میں نے جواب دیا

ناصر کاظمی نے چائے کی پیالی میں سگریٹ بجھائی۔اور کہنے لگے

''ایک بات یاد رکھنا عقیل روبی۔ یہ بد بخت زندگی کبھی کسی کو موقعہ نہیں دیتی۔موقعہ تلاش کرنا پڑتا ہے۔''

یہ کہہ کر ناصر کاظمی کھڑے ہوئے میں نے پوچھا۔

''آپ کھڑے کیوں ہو گئے۔آپ کہاں جا رہے ہیں''

ناصر کاظمی مُسکرا کر بولے

''یہاں سے جانے کا موقعہ تلاش کر رہا ہوں۔آج حلقہ ارباب ذوق میں میرا ایک جاننے والا بہت بے ہودہ سا مضمون پڑھنے جا رہا ہے۔مجھ سے اُس نے وعدہ لیا ہے کہ میں حلقے میں ضرور آؤں۔ میں وعدہ نبھانے جا رہا ہوں حالانکہ میرے جانے سے مضمون میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔مضمون بے ہودہ ہی رہے گا۔''

وہ جانے کے لئے مڑے لیکن پھر رک گئے اور جیب میں ہاتھ ڈال کر گولڈ لیف کی ایک ڈبیہ نکال کر میری طرف پھینک کر کہنے لگے۔

''یہ سگریٹ اچھی ہے مگر مہنگی ہے۔سوچا تھا دو ڈبیاں خرید لوں مگر ایک ہی خرید سکا۔''

یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر چلے گئے۔

چھے سات مہینے بساکھیوں نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔اللہ اللہ کر کے جب وہ میری بغلوں کا پیچھا چھوڑ کر کمرے کے کونے میں جا کھڑی ہوئیں تو بن سنور کر ناصر کاظمی سے ملنے گیا اتفاق سے وہ گھر ہی میں تھے۔چھت پر کبوتروں کو دانہ ڈال رہے تھے غالباً اتوار کا دن تھا۔عنصر کاظمی نے دروازہ کھولا مجھے دیکھ کر عنصر کہنے لگے۔

''بھائی آپ کواوپر بلا رہے ہیں۔آ جائیں''

میں عنصر کے ساتھ چھت پر چلا گیا ناصر کاظمی ایک کبوتر کو ہاتھ میں پکڑ کر اس کے پَر سیدھے کرتے ہوئے میری طرف دیکھ کر بولے۔

''Very Good''

اور پھر کبوتر کو ہوا میں اُڑا کر میری طرف آئے اور مجھے نیچے سے اوپر تک دیکھا اور کہنے لگے۔

''تمہیں مکمل دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔ٹوٹی ٹانگ والا آدمی بھی کوئی آدمی ہوتا ہے۔اسے آدمی نہیں لنگڑا آدمی کہتے ہیں۔''

پھر میرا بازو تھام کر سیڑھیوں کی طرف بڑھے اور کہنے لگے ''اگر لنگڑا بننا ہی پڑے تو آدمی وارث شاہ کا کیدو بنے کم از کم ادب میں کوئی پہچان تو ہو''

سیڑھیوں سے اتر کر جب ہم کمرے میں آ کر بیٹھے اور ناصر کاظمی نے چائے کا آرڈر دے کر سگریٹ سلگایا تو دھواں چھوڑ کر کہنے لگے

''کیدو بہت اچھا آدمی تھا۔''

میں نے مسکرا کر کہا۔

''مگر اس نے کام بہت برے کئے ہیر اور رانجھا کو مصیبت میں ڈال دیا۔''

ناصر کاظمی کے چہرے پر ذرا سا غصے کا رنگ آیا اور میری طرف دیکھ کر بولے۔

''اور رانجھا نے ٹھیک کیا احسان فراموش ،جس شریف آدمی نے رہنے کو جگہ دی کھانے کو روٹی دی اس کی عزت پر ہاتھ ڈال دیا۔''

پھر میری طرف دیکھ کر بولے۔

''اگر چوچک مجھے یہ ساری مراعات دیتا تو جانتے ہو میں کیا کرتا''۔

''کیا کرتے آپ''

میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''میں ہیر کو صرف دیکھتا اور شاعری کرتا کیدو کا سارا Plan دھرے کا دھرا رہ جاتا۔''
یہ کہہ کر ناصر کاظمی بہت دور نکل گئے اور سوچ کر بولے۔

''یہ وراث شاہ بہت بڑا دماغ تھا۔ بڑا شاعر تھا اسے ہاتھ پکڑ کر دنیا کے کسی بھی بڑے شاعر کے ساتھ بٹھا دو برابر کی چوٹ ہے''

آپ نے ٹھیک کہا ہے ناصر بھائی ''ہیر'' کئی بار لکھی گئی مگر جو ڈکشن (DICTION) وارث شاہ نے اپنایا اس کی بات ہی کچھ اور ہے''

''کوئی مانے نہ مانے میں تو وارث شاہ کو پنجابی زبان کا ہومر (HOMER) مانتا ہوں تمہارا کیا خیال ہے''

میں نے جواب دیا

''اس میں کوئی شک نہیں ہومر نے بھی اپنی نظموں میں یونان کا کلچر ثقافت اور تہذیب کے مرقعے کھینچے ہیں وارث شاہ نے بھی اپنے عہد کی تہذیبی تصویریں دکھائی ہیں۔''

ناصر کاظمی نے دوسری سگریٹ جلانے کے لئے اپنی ڈبیہ اٹھائی جو خالی تھی ڈبیہ ٹرے میں رکھ کر کہنے لگے۔

''یہ سگریٹ کی ڈبیہ بھی بے وفا عورت کی طرح کبھی کبھی ہاتھ چھڑا کر چلی جاتی ہے، کتنی اچھی گفتگو ہو رہی تھی سگریٹ ختم ہو گئی''

میں نے اپنی ڈبیہ سے سگریٹ نکال کر سلگائی اور ناصر بھائی کو دی انہوں نے سگریٹ میرے ہاتھ سے لی اور اس دوران عنصران کے لئے سگریٹ لینے جا چکے تھے۔

ناصر کاظمی نے سگریٹ کا کش لیا۔ میں نے انہیں سوچ میں گم دیکھ کر پوچھا

''آج آپ پنجابی شاعری پر بہت مہربان نظر آرہے ہیں۔''

ناصر کاظمی نے میری طرف دیکھ کر غصے میں کہا۔

''تم عجیب بے وقوف آدمی ہو پنجابی شاعری کا میں دشمن کب تھا خواہ مخواہ شفقت تنویر مرزا کو میرے خلاف اکسا رہے ہو۔ انبالے اور پنجاب میں فرق ہی کتنا تھا اور پھر میری تو رشتے

داریاں بھی پنجاب کے لوگوں کے ساتھ ہیں اور دوستیاں بھی ۔احمد مشتاق،صوفی تبسم ،شاد امرتسری اور عقیل روبی ۔کیا تم سب لوگوں کا تعلق لکھنو سے ہے۔'' اس دوران عنصر سگریٹ اور چائے لے کر آ گیا تو کہنے لگے۔

''عنصر بہت اچھا بھائی ہے آج یہ تمھیں اور مجھے بہت اچھا کھانا کھلائے گا۔''

عنصر نے قہوہ پیالی میں انڈیل کر پوچھا۔

''دوپہر میں کیا کھائیں گے بھائی۔''

ناصر کاظمی نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

''عقیل روبی کے غسل صحت کی خوشی میں پائے پکائے جائیں تو کیسا رہے گا۔''

عنصر کاظمی مسکرا کر کہنے لگے۔

''کیسا اتفاق ہے میں رات ہی سری پائے خرید کر لایا ہوں۔''

ناصر مسکرا کر کہنے لگے۔

''مہمان اپنا رزق ساتھ لے کر آتے ہیں۔عقیل روبی صبح آیا ہے لیکن اس نے اپنا رزق رات ہی تمہارے ہاتھ بھیج دیا۔''

اور پھر میری طرف بڑے پیار سے دیکھ کر بولے۔

''اور کیا حال ہے۔''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''تمہاری رکی ہوئی تنخواہیں مل گئیں۔''

میں نے عنصر کی طرف دیکھ کر کہا۔

''عنصر بھائی نے (A.G) آفس کے سارے کام کرا دیئے ہیں۔''

''Very Good'' ناصر نے عنصر کی طرف دیکھ کر کہا۔

''عنصر کاظمی بہت نیک آدمی ہے ہر پروفیسر کے کام آتا ہے۔وہ اسے دعائیں دیتے ہیں دوسروں کے کام آنا سب سے بڑی نیکی ہے۔''

اور پھر سینہ تان کر بولے

''محبوب خزاں A-G آفس کا بہت بڑا افسر ہے وہ اچھا شاعر ہی نہیں اچھا آدمی بھی ہے تمہارا کوئی کام رک ہی نہیں سکتا۔''

یہ کہہ کر وہ کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے اور ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں دو پہر کو سری پائے کھائے گئے شام کے چار بجے تو میں نے کہا۔

''اچھا ناصر بھائی میں چلتا ہوں۔''

''کہاں۔''

''گھر جاؤں گا۔''

''گھر چار بجے گھر جاؤ گے۔کوئی شریف آدمی چار بجے بھی بھلا گھر جاتا ہے۔گھر جانے کے لئے صبح چار بجے کا ٹائم مناسب ہے۔''

میں ان کی بات سن کر مسکرایا اور دل ہی دل میں کہنے لگا۔

''عقیل روبی رات گئی۔''

ناصر کاظمی مجھے چپ دیکھ کر بولے۔

''تم آج کہیں نہیں جاؤ گے آج کی شام اور آنے والی رات کا پہلا حصہ میرے نام ہے۔ پتہ نہیں کیوں میرا دل چاہ رہا ہے کہ آج میں کسی سے نہ ملوں۔سارا وقت تمہارے ساتھ گزاروں۔باغ میں چلتے ہیں چڑیوں کے گیت سنیں گے۔زرد پتوں کی راگنی کانوں میں اتاریں گے اور دونوں فطرت کے ساتھ بات چیت کریں گے۔''

اس دن ناصر کاظمی پیدل چلنے کی بجائے بس میں بیٹھ کر میرے ساتھ باغ جناح گئے۔انہیں پیدل چلنے میں تھوڑی سی تکلیف ہو رہی تھی۔انہیں شاید احساس ہو گیا تھا کہ میں نے ان کی تکلیف کو محسوس کر لیا ہے کہنے لگے۔

''بہت رش ہو گیا ہے لاہور کی سڑکوں پر۔آدمیوں کا جنگل آ گیا ہے کہیں سے۔ ہر طرف آدمی ہی آدمی ہیں لیکن آدمیوں جیسا کوئی بھی نہیں۔''

میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

''وہ کولرج کی کون سی لائن ہے۔''

میں سمجھ گیا کہ ANCIENT MARINER کی بات کر رہے ہیں۔

میں نے جواب دیا۔

" WATER WATER EVERY WHERE

BUT NOT A DROP TO DRINK "

پھر کولرج کا ذکر چھڑ گیا۔ میں نے کولرج کی نظموں کے کچھ منظوم ترجمے کیئے تھے۔ مجھے سنانے کے لئے کہا۔ جتنے ترجمے زبانی یاد تھے میں نے سنا دیئے۔ جناح باغ آ گیا ہم بس سے اترے باغ میں داخل ہوتے ہوئے کہنے لگے

''بڑا عجیب آدمی تھا کولرج بڑی اچھی باتیں کرتا تھا۔''

میں نے کہا۔

''آپ کی طرح۔''

''فضول باتیں کرتا ہوں میں۔ تم لوگ مجھ سے محبت کرتے ہو اس لئے تمہیں اچھی لگتی ہیں۔ عقل مندی کے ترازو میں اگر ان باتوں کا وزن کرو تو سب کی سب بے وزن ہیں''۔

''لیکن میں تو انہیں بہت وزنی سمجھتا ہوں''

''تم بھی میری طرح فضول ہو صبح سے میرے پاس بیٹھے ہو کیا حاصل کر رہے ہو تم'' ناصر کاظمی نے گراؤنڈ میں رکھے پتھر کے بینچ پر بیٹھ کر کہا

''جو کچھ حاصل ہو رہا ہے اس کا آپ کو نہیں مجھے پتہ ہے''

گراؤنڈ کے ایک کونے میں ایک عورت اپنے دو بچوں کو لے بیٹھی تھی۔ بچے گیند سے کھیل رہے تھے۔ ایک بچے نے گیند پر زور سے کک ماری تو گیند اچھلتی ہوئی ہمارے قریب آ کر گری۔ بچے ماں کی طرح خوبصورت تھے۔ ماں نے بچے کو کچھ کہا بچہ گیند لینے کے لئے ہمارے قریب آ کر کھڑا ہو گیا گیند اٹھائی اور ناصر کاظمی کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور ناصر کاظمی کی طرف

دیکھ کر کہنے لگا۔

''آپ کا نام ناصر کاظمی ہے نا۔''

ناصر کاظمی بچے کی اس بات پر چونک گئے۔

''جی میرا نام ناصر کاظمی ہے۔''

''میری ماما کہہ رہی ہیں آپ بڑے اچھے شاعر ہیں۔''

ناصر کاظمی بچے کی بات سن کر ہنس کر بولے۔

''شکریہ اپنی ماما کو میرا آداب کہئے۔''

بچہ یہ بات سن کر بھاگتا ہوا گیند لے کر چلا گیا اور ناصر کہنے لگے۔

''اس خاتون کو کیسے پتہ چلا کہ میں ناصر کاظمی ہوں۔''

''آپ کو T.V پر یا کسی مشاعرے میں دیکھ لیا ہوگا۔''

یہ تو اچھی بات نہیں۔ میں تو یہاں تنہائی کی تلاش میں آیا تھا یہاں بھی جاننے والے مل گئے چلو یہاں سے چلتے ہیں۔''

ناصر کاظمی یہ کہہ کر کھڑے ہو گئے اور میرا ہاتھ پکڑ کر دوسرے گراؤنڈ کی طرف چل دیئے۔ درختوں پر چڑیوں کا راگ میلہ شروع تھا۔ ہوا چل رہی تھی اور درختوں کے پتوں سے کھیل رہی تھی اور ہوا میں ایک مدھم مدھم ترنم پھیلا ہوا تھا۔ ناصر کاظمی نے درختوں اور پھولوں پر ایک نظر ڈالی اور کہنے لگے۔

''یہ درخت یہ پھول، ہوا، گھاس اور سوکھے پتے سب خوشی کے سفیر ہیں فطرت نے ہمارے دکھ درد دور کرنے کے لئے دنیا میں بھیجا ہے۔ یہ پرندے جو ہوا میں اڑ رہے ہیں کتنے آزاد اور خوش ہیں۔ نہ انہیں بجلی کے بل کی فکر ہے نہ انہیں گھر کا کرایہ دینا ہے۔ جو مل گیا کھا لیا۔ جہاں جگہ ملی سو گئے۔''

کاش میں بھی پرندہ ہوتا۔

''تو پھر ہمارے ساتھ بڑا ظلم ہوتا'' میں نے کہا۔

''کیوں ظلم کیوں ہوتا''؟ ناصر چونک کر بولے۔

''آپ پرندے ہوتے تو ہمیں اچھی شاعری کون سناتا۔''

''لاحول ولاقوۃ''،تمہیں اچھی شاعری کی فکر ہے میری آزادی کا کوئی خیال نہیں۔''

گراوَنڈ بالکل خالی تھا ناصر ایک پھولوں کی کیاری کے پاس بیٹھ گئے میں بھی پاس بیٹھ گیا کہنے لگے

''ویسے دو ایک شعر تم نے بھی بہت اچھے کہے ہیں۔''

میں یہ سن کر بہت خوش ہوا اور اچانک میرے منہ سے نکلا۔

''چلیں میرا جیون تو سپھل ہو گیا۔''

ناصر نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا کہنے لگے۔

''خاص طور پر وہ شعر جس میں تم نے رات کو خاموشی کا قفل لگایا ہے کیا شعر ہے وہ۔''

میں نے بڑی ہمت سے شعر سنایا۔

رات کے کڑیل دروازے پر

خاموشی کا قفل پڑا ہے

''Very Good''ناصر کاظمی بولے اور کہنے لگے

''جب تم نے یہ شعر کہا تو تم کہاں کھڑے تھے''

میں ناصر کاظمی کی یہ بات سن کر بہت چکرایا اور بے وقوفوں کی طرح ناصر کاظمی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''کیا مطلب ہے آپکا۔''

ناصر کاظمی نے اپنے سامنے پھولوں کی کیاری کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''فرض کرو یہ رات ہے تم نے اسے خاموشی کا قفل لگایا تم رات سے باہر کھڑے ہو۔''

''جی''

''سامنے رات ہے رات کے دروازے پر قفل پڑا ہے تم کہاں کھڑے ہو۔''

میں ناصر کاظمی کی بات سن کر خاموش رہا ناصر کہنے لگے۔

''یہ شعر تم سے ہو گیا ہے تم نے کہا نہیں چلو ٹھیک ہے مجھے ایک بات کی تو تسلی ہو گئی کہ گوہر نوشاہی نے ایک شاعر سے مجھے ملوایا کسی فضول آدمی سے نہیں ملوایا۔''

پھر اچانک ان کے چہرے پر پریشانی کی ایک پرچھائیں سی لہرائی اور کہنے لگے۔

''کیا وقت ہوا ہے۔''

میں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔

''6 بجے ہیں۔''

ناصر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے۔

''چلو گھر چلتے ہیں گھر چل کر باتیں کریں گے۔''

ہم باغ جناح سے نکلے پلازا سینما کے سامنے سے ہوتے ہوئے گنگا رام چوک سے ریگل سینما کی طرف مڑ گئے۔ مولا بخش کی دوکان سے ناصر کاظمی نے پان کھایا دو پان کاغذ میں لپیٹ کر جیب میں رکھے اور پھر چل دیئے۔ تھوڑی دور چل کر ناصر کاظمی رک گئے اور کہنے لگے۔

''کوئی ایسا راستہ اختیار کیا جائے جس راستے پر ٹی ہاؤس نہ آتا ہو چلو ادھر سے چلتے ہیں''

اور پھر ہائی کورٹ کے پیچھے سے اس سڑک پر چل دئے جو جین مندر کی طرف جاتی ہے اور پھر ایم۔اے۔او کالج سے ہوتے ہوئے کرشن نگر پہنچ گئے مجھے کمرے میں بٹھا کر ناصر بھائی خود اندر چلے گئے اور پھر پاجامہ اور کرتہ پہن کر کر واپس آ گئے۔ پیچھے پیچھے عنصر حقہ لے کر آ گیا۔ ناصر بھائی نے حقے کی نڑی ہاتھ میں لی اور کہنے لگے۔

''میں گھر میں سگریٹ بہت کم پیتا ہوں۔''

اور پھر حقے کا ایک طویل کش لے کر کہنے لگے۔

''حقہ ہماری تہذیب کا بہت اہم حوالہ ہے اس سے دوستیاں بڑھتی ہیں۔''

مجھے خاموش دیکھ کر کہنے لگے۔

''کسی سے شناسائی ہو یا نہ ہو وہ حقہ لے کر بیٹھا ہو تو راہ چلتا راہی سلام کر کے پاس آ بیٹھتا ہے اور حقہ پینے لگتا ہے اور پھر شناسائی کے دروازے کھلنے لگتے ہیں۔''

''بالکل ٹھیک کہتے ہیں آپ جب کسی سے قطع تعلق کرنا ہو تو اس کا حقہ پانی بند کر دیا جاتا ہے۔''

میں نے بات آگے بڑھائی ناصر کاظمی میری بات سن کر کہنے لگے۔

''بڑی ظالم چیز ہے یہ۔اس کے لئے کچھ لوگ جنت چھوڑ کر دوزخ میں آ بستے ہیں۔''

میں نے حیرانی سے ناصر بھائی کو دیکھ کر پوچھا۔

''وہ کیسے؟''

ناصر کاظمی نے ٹانگیں اٹھا کر کرسی پر رکھیں اور کہنے لگے۔

''ایک کہانی ایک حقہ پسند من چلے نے گڑھی ہے جنت میں تمبا کو نوشی ہو نہیں سکتی۔دوزخ میں رہنے والے کچھ لوگوں نے دوزخ کے دوازے پر بیٹھ کر حقہ پینا شروع کر دیا۔جنت میں رہنے والے کچھ لوگوں نے جنت کی کھڑکی سے یہ منظر دیکھا اور رضوان کی نظر بچا کر جنت سے نکل کر دوزخ کے دروازے پر آ گئے اور حقہ پینے لگے۔حقہ پی کر جب دوبارہ جنت میں جانے لگے تو رضوان نے کہا۔

''اب تم دوبارہ اندر نہیں جا سکتے۔جاؤ وہیں رہو جہاں سے آئے ہو۔''

وہ یہ کہہ کر دورزخ کی طرف بڑھے۔

''چلو ٹھیک ہے کم از کم وہاں حقہ تو ہے۔''

ناصر کاظمی نے کہانی ختم کی تو عنصر کاظمی نے کہا۔

''بھائی کھانا لے آؤں۔''

''کیا کھلا رہے ہو۔'' ناصر نے عنصر سے پوچھا

''ارہر کی دال اور قورمہ''

''Very Good'' ناصر کاظمی میری طرف دیکھ کر بولے۔

''تم آئے ہو تو ساری نصیحتیں میرے گھر میں اتر آئی ہیں۔''

''شفیقہ تمیں بہت پسند کرتی ہے وہ کہتی ہے عقیل روبی بہت شریف لڑکا ہے''

پھر ناصر کہنے لگے۔

''میں نے کہا ہاں شریف آدمی ہے لیکن ہے بہت بے وقوف۔ میں اس کے پاس بہاولپور گیا خط میں پہلے سے اطلاع دی کہ میرے لئے روشنی کا اچھا سا اہتمام کرنا بے وقوف آدمی نے کمرے میں دوسو وولٹ کا بلب لگا دیا۔''

میں نے ہنس کر کہا۔

''لیکن ناصر بھائی میں نے بعد میں اپنی حماقت کا ازالہ کر دیا تھا۔''

''ہاں تو تم نے روشنی کا پورا کریٹ میرے سامنے لا کر رکھ دیا تھا میں نے تمہاری یہ بات منیر نیازی کو بتائی تو وہ ماتھے پر ہاتھ مار کر کہنے لگا یار میں وہاں کیوں نہیں تھا''

اس دوران عنصر کاظمی کھانا لے کر آ گئے حسن کاظمی اور باصر پانی کا جگ لے کر ساتھ تھے۔

ناصر نے ان سے پوچھا ''آپ لوگوں نے کھانا کھایا۔''

دونوں نے انکار میں سر ہلایا اور پھر ناصر نے ان سے کہا

''جایئے کھانا کھایئے''

وہ دونوں چلے گئے تو ناصر نے دونوں ہاتھ مل کر مجھے کہا۔

''شروع کرو۔''

میں نے کہا ''پہلے آپ لیں۔''

ناصر نے اپنی پلیٹ میں سالن لیا اور پھر میں نے پلیٹ اٹھائی۔ کھانے کے دوران مختلف باتیں ہوتی رہیں کھانے کے بعد جب ہم چائے پی رہے تھے تو ناصر نے پوچھا۔

پروفیسر سجاد باقر رضوی کا کیا حال ہے۔

''جی ان سے مل کر آپ کی طرف آیا تھا''

''کیا حال ہے پروفیسر صاحب کا''

''ٹھیک ہے کیا آپ کو ان سے ملے کافی دن ہو گئے ہیں۔''میں نے پوچھا۔
''نہیں کل ملاقات ہوئی تھی آج نہیں ہوئی اس لیے حال پوچھا ہے۔حالات کا کچھ پتہ نہیں پل میں نہ جانے کیا سے کیا ہو جائے گا۔''

اسی دوران T-V پر شاید فریدہ خانم کوئی غزل گا رہی تھیں T-V اندر چل رہا تھا آواز باہر ہم تک پہنچ رہی تھی ناصر نے آواز سن کر کہا۔

''سبحان اللہ آواز کے نشیب و فراز میں فریدہ خانم کیا اچھی شاعری کر رہی ہیں۔''

''جی ہاں شاید اس لئے کہ شاعری اور موسیقی جڑواں بہنیں ہیں ناں۔''

''بالکل ناصر بولے اصل میں شاعری اور موسیقی ہی نہیں فنون لطیفہ کی ساری اقسام رشتے میں ایک ہیں۔سب اظہار کی مختلف اشکال ہیں۔خمیر سب کا ایک ہی مٹی سے اٹھا ہے۔''

اور پھر ناصر کاظمی نے فنون لطیفہ پر ایک طویل گفتگو کا آغاز کر دیا دو تین بار چائے آئی اور رات کے 12:00 بج گئے میں نے ایک بجے عنصر کو نیند کے جھٹکے کھاتے دیکھا تو ناصر کاظمی سے کہا۔

''میں اجازت چاہوں گا ناصر بھائی۔''

ناصر کاظمی نے مولا بخش سے لیا ہوا آخری پان منہ میں رکھ کر پوچھا۔

''کیسے جاؤ گے۔''

''یہاں سے پیدل سیکرٹریٹ چلا جاؤں گا وہاں سے رکشہ لے لوں گا۔''

ناصر کاظمی نے عنصر کی طرف دیکھ کر کہا۔

''آج عقیل روبی کو پورا پروٹو کول دیا جائے گا۔''

جی بھائی عنصر بولے۔

''تم جاؤ اور ٹانگہ لے کر آؤ۔''

میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

رہنے دیں ناصر بھائی ''میں چلا جاؤں گا۔''

ناصر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''اس کی مت سنو تم جا کر تانگہ لے کر آؤ عنصر۔''

عنصر کاظمی اٹھے اور دروازے کی طرف بڑھے۔

ناصر کاظمی نے عنصر کو روکا اور کہا۔

''سنو عنصر تانگے کا گھوڑا بالکل سیاہ ہونا چاہیے۔''

''جی بھائی گھوڑا کالا ہی ہوگا'' عنصر یہ کہہ کر چلے گئے۔

ناصر نے میری طرف دیکھا اور کہنے لگے۔

''کالا گھوڑا خوش بختی کی علامت ہوتا ہے۔ بلکہ یوں کہو کہ کالا رنگ خوش بختی کی علامت ہوتا ہے۔ (غلاف کعبہ) بھی سیاہ رنگ کا ہے۔ کربلا میں علم بھی سیاہ رنگ کے تھے اور سیاہی بھی کالی ہوتی ہے جس سے علم اپنا راستہ اختیار کرتا ہے۔''

یہ کہہ کر ناصر چپ ہو گئے اور پھر کچھ سوچ کر بولے'' کالا رنگ ہندوؤں کا بھی مقدس رنگ ہے کیونکہ کرشن کا رنگ بھی کالا ہے۔''

پھر ناصر کاظمی نے کرشن کنیا کی ساری کہانی سنا دی۔ جیل میں اس کی پیدائش ماموں کا کرشن کے خلاف قتل کا منصوبہ بنانا اور پھر اس کرشن کہانی میں 3 بج گئے۔ نہ ناصر کاظمی کی آنکھ جھپکی اور نہ ہی عنصر کاظمی تانگہ لے کر آیا۔ میرے پاس اس وقت کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا ناصر کاظمی شاید اس وقت گانے کے موڈ میں تھے وہ اپنی موٹی آواز میں بھگت کبیر کا ایک دوہا گنگنا رہے تھے

دکھ میں سب سمرن کریں!

سکھ میں کرے نہ کوئے

سکھ میں جو سمرن کریں!

دکھ کاہے کو ہوئے۔

میں بڑی دیر تک ان کی آواز سے لطف اندوز ہوتا رہا پھر اچانک ایک غیر متعلقہ سا

سوال کردیا۔

ناصر بھائی کبوتروں کے جاگنے کا وقت کیا ہے؟

''ان کے جاگنے کا کوئی وقت نہیں لیکن سرگودھا والا میرا کبوتر سوتا ہی نہیں۔اسے اب تک سرگودھا سے ہجرت کرنے کا دکھ کھائے جا رہا ہے سوتا ہی نہیں

''اور پھر وہ کھڑے ہو گئے'' آؤ اوپر چل کر دیکھتے ہیں کیا وہ ابھی تک جاگ رہا ہے۔''

چھت پر ابھی اندھیرا تھا۔میں نے کمرے سے سیڑھیوں کی طرف جاتے ہوئے کھڑکی پر نظر ڈالی۔4:00 بجے تھے۔ناصر کاظمی نے کبوتروں کے ڈربے میں جھانک کر دیکھا سب کبوتر گردنیں جھکائے سو رہے تھے۔کچھ کبوتروں نے آہٹ پر آنکھیں کھولیں۔ناصر کاظمی نے سرگودھا والے کبوتر کو تلاش کر ہی لیا اور میری طرف دیکھ کر کہنے لگے۔

''GOOD سو رہا ہے۔''

ناصر کاظمی پھر دونوں ہاتھوں کو آپس میں رگڑ کر بولے۔

''میں اسے سرگودھا سے خرید کر لایا تھا بڑا نسلی کبوتر ہے۔''

سرگودھا کے ذکر پر مجھے ڈاکٹر وزیر آغا کے ساتھ ناصر کاظمی کی واردات یاد آ گئی۔جس کا تذکرہ لاہور کے ادیبوں میں مسلسل چل رہا تھا۔ڈاکٹر وزیر آغا سرگودھا میں رہتے ہیں۔وزیر کوٹ میں ادیبوں کی آمد و رفت لگی رہتی ہے۔ڈاکٹر صاحب کا لاہور اکثر آنا جانا لگا رہتا ہے ایک بار لاہور آئے ناصر کاظمی سے ملاقات ہوئی تو ناصر کاظمی نے کہا۔

''آپ سے ملاقات تو ہوتی ہے مگر کھل کے بات نہیں ہوتی کوئی تفصیلی ملاقات ہونی چاہیے۔''

ڈاکٹر وزیر آغا نے کہا۔

''وزیر کوٹ تشریف لائیں دو چار دن میرے ساتھ گزاریں کھل کر باتیں ہوں گی''

ناصر کاظمی نے وزیر آغا سے پوچھا۔

"اب آپ کہاں جا رہے ہیں۔"

"واپس سرگودھا جا رہا ہوں۔" ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

"تو پھر میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔"

ناصر کاظمی نے کہا۔

"تشریف لایئے" اور ناصر کاظمی ڈاکٹر وزیز آغا کی گاڑی میں بیٹھ گئے بقول ڈاکٹر وزیر آغا سارے راستے ناصر کاظمی نے کھل کر باتیں کیں، دل چسپ، حیرت انگیز اور تہہ دار باتیں جب سرگودھا آ گیا اور ڈاکٹر وزیر آغا کی گاڑی وزیر کوٹ کے سامنے رکی تو ناصر کاظمی کہنے لگے۔

"میں ابھی آیا۔"

"آپ کہاں جا رہے ہیں۔"

ناصر کاظمی کہنے لگے۔

سرگودھا میں مجھے اچھے نسلی کبوتروں کی خبر ملی ہے میں دیکھ کر ابھی آیا آپ جلدی سے کھانا تیار کرائیں بہت زور کی بھوک لگی ہے۔

یہ کہ کر ناصر کاظمی چلے گئے 6 مہینے بعد ڈاکٹر وزیر آغا سے ان کی لاہور میں ملاقات ہوئی۔

"کیا سوچ رہے ہو مجھے چپ دیکھ کر ناصر کاظمی نے پوچھا"

"کچھ نہیں" میں کہا

"چلو نیچے چلتے ہیں شاید عنصر کاظمی ٹانگہ لے کر آ گیا ہوگا

ہم نیچے آئے تو واقعی عنصر کاظمی آ چکا تھا وہ بہت تھکا تھکا نظر آ رہا تھا آنکھوں میں نیند کی پرچھائیاں تھیں، وہ ناصر کاظمی کو دیکھ کر بولا

"بھائی ٹانگہ نہیں ملا"

"کیوں کیا ہوا کیا حکومت نے ٹانگوں پر BAN لگا دیا ہے۔"

"ٹانگے تو بہت ہیں بھائی لیکن کالے گھوڑے والا ٹانگہ کوئی نہیں"

ناصر کاظمی کو یہ سن کر بڑی مایوسی ہوئی میری طرف دیکھ کر بولے۔

''اب کیا کریں۔''

میں نے مسکرا کر ناصر کاظمی کی طرف دیکھا اور کہا۔

''دن نکل آیا ہے میں پیدل چلا جاؤں گا۔''

ناصر نے ایک انگڑائی لی میں نے بات مکمل کی

''آپ کی رات ہوگئی ہے آپ آرام کریں۔''

ناصر کاظمی سے شاید یہ میری طویل اور آخری ملاقات تھی۔

ناصر کاظمی کو زندگی سے بہت پیار تھا۔ زندگی کی پٹاری میں رکھی ہوئی ہر چیز کو سلیقے سے پرکھا۔ چیزوں کے حسن کو ہر زاویے سے دیکھا۔ گفتگو اور اشعار میں ان چیزوں کی ہنرمندی سے تصویر کشی کی۔ سایہ گل کی ٹھنڈک کو محسوس کیا۔ اولیں چاند میں انگشت حنائی کے نقش ڈھونڈے۔ تیز ہوا چلے تو لوگ گھر کی کھڑکیاں بند کر لیتے ہیں۔ مگر ناصر کاظمی نے ہوا کا راستہ روک کر اس سے گیت سنے۔ شاید انہیں پتہ تھا کہ ان کے حصے میں بڑی مختصر حیات آئی ہے اس لئے انہوں نے اسے حسن کے مختلف صوبوں میں بسر کیا اور بہت بچا بچا کر خرچ کیا آخری دنوں میں تو زندگی کی بہت ناز برداری کی۔

ڈاکٹر اکبر سیال ان کے آخری معالجوں میں شامل تھے۔ ناصر کاظمی کو آخری دنوں میں قے کا مرض لاحق تھا۔ ڈاکٹروں نے ناصر کاظمی کو گرم اشیاء کے استعمال سے روکا۔ ڈاکٹر سیال نے مشورہ دیا کہ ناصر ٹھنڈے پانی کا استعمال کریں۔ جو ہسپتال میں لگے کولر سے عام دستیاب تھا۔ ڈاکٹر اکبر سیال کہتے ہیں وہ شام کو ناصر کاظمی کو دیکھنے گئے تو ناصر کاظمی کے کمرے میں ایک چھوٹا سا ریفریجریٹر رکھا ہوا تھا۔ اکبر سیال کو حیرانی ہوئی۔ ڈاکٹر سیال نے ناصر کاظمی سے کہا۔

''اس کی کیا ضرورت تھی۔ ٹھنڈا پانی تو ہسپتال میں عام تھا۔''

ناصر کاظمی کہنے لگے۔

''پانی دور تھا۔ میں نے ٹھنڈے پانی کا چشمہ قریب ہی رکھ لیا ہے۔۔۔۔''

پھر کچھ سوچ کر کہنے لگے۔

''یہ پیسہ تو ہاتھ کی میل ہے۔ زندگی بار بار تو نہیں ملتی۔ اتنی قیمتی چیز ٹھنڈے پانی کے

ایک گلاس سے بجتی ہے تو اسے ضرور بجانا چاہئے۔"

ناصر کاظمی بیمار تو کافی عرصے سے ہونگے مگر وہ زندگی کی خوبصورتیوں میں اس قدر مگن تھے کہ انہوں نے کبھی اندرون خانہ پھیلتی اس بدصورت بیل کو دیکھا ہی نہیں۔ اس بیل کے پیلے اور کالے پھول ۱۹۷۰ء میں ان کے چہرے پر کھلے۔ مجھے جب وہ ہسپتال ملنے آئے تو میں نے چہرے پر بیماری کے آثار دیکھے۔ میرے پوچھنے پر ہنس کر ٹال گئے۔

"یار بیماریاں تو آتی جاتی رہتی ہیں۔ خاکدان دنیا میں سدا کون رہا ہے۔" اصیل مرغ کی طرح سینہ تان کر چلنے والے ناصر کاظمی نے ۱۹۷۰ء کے بعد اپنے اندر ٹوٹ پھوٹ کا شور سنا مگر وہ سنی ان سنی کرتے رہے۔ ہسپتال جاتے تو عملے کے لوگوں کو اپنی گفتگو کی زنجیریں پہنا کر بری طرح جکڑ دیتے اور خود بیڈ خالی چھوڑ کر سرِ شام ہسپتال سے بھاگ آتے اور لاہور کی گلیوں اور سڑکوں پر گھومتے رہتے۔

ناصر کاظمی کے اندر ہومر (Homer) کا جہاں گرد لوڈی سی ایس چھپا بیٹھا تھا جس نے انہیں ساری عمر بے چین رکھا۔ ناصر کاظمی کی RESTLESS SOUL نے انہیں ساری عمر رستوں اور گلیوں کی خاک چھنوائی اور وہ دور دراز کسی علاقے میں واقع جزیرے کی تلاش کرتے رہے۔ اس جزیرے میں وہ پیدل جانا چاہتے تھے ایسا جزیرہ جہاں سایہ گل ہو۔ پتوں کی پازیب جھرنوں کی تال پر نغمے گنگنائے۔ جہاں اداسی کی دلہن دیواروں پر بال کھول کر نہ سوئے۔ یہ جزیرہ ناصر کاظمی کے اندر موجود تھا لیکن ناصر کاظمی اسے ایک پیکر دینا چاہتے تھے۔ جسے انسانی آنکھ دیکھ سکے اور ہاتھ چھو سکے۔ جہاں انسان دکھ درد کی گرد جھاڑ کر بہتی ندی کے ٹھنڈے پانی میں پاؤں ڈال کر پرندوں کے گیت سن سکے۔ چڑیوں کی گھریلو اور نجی لڑائیاں دیکھ سکے۔۔۔ ناصر کاظمی اس جزیرے کے متلاشی تھے۔ یہی جزیرہ ناصر کاظمی کی آئیڈیالوجی تھا۔ یہی ناصر کاظمی کی جمہوریہ (REPUBLIC) اور یوٹوپیا (UTOPIA) تھی۔ اس یوٹوپیا (UTOPIA) میں ناصر کاظمی سایہ گل میں تخت بچھا کر بیٹھنا چاہتے تھے۔ ایسا تخت جس کے چاروں طرف فوج کے میجر کیپٹن، سی، ایس پی افسران بیٹھے گوش برآواز ہوں۔ ناصر کاظمی انہیں

حیرت بھری باتیں سناتے رہیں۔ جھوٹ میں سچ کا سونا ملا کر زیورات بناتے رہیں۔ ان کے جھوٹ پر کسی کو شک نہ ہو۔ کوئی لب نہ کھولے اگر بولے تو صرف ناصر کاظمی کو داد دینے کے لئے ۔۔۔۔اس کی ریہرسل وہ ساری زندگی کرتے رہے۔ اپنے گرد لوگوں کا ہجوم اکٹھا کیا۔ خوبصورت جھوٹ بولے۔ اپنی گفتگو سے ہتھیلی پر سرسوں جمائی ۔ حیرت انگیز مبالغہ آرائی کی۔ ناقابل فراموش شعر کہے۔ تجرباتی غزلیں کہیں۔ لیکن پوچھنے پر ہمیشہ یہی کہا۔

''چھوڑ و یار۔ سب بکواس ہے۔ ساری زندگی جھک ماری۔ کوئی سلیقے کا کام نہیں کیا۔''

ناصر کاظمی کے دروازے پر موت نے دو بار دستک دی تیسری بار دروازہ بہت زور سے کھٹکھٹایا۔ ناصر کاظمی باہر نکلے اور وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئی۔ ناصر کاظمی پر بیماری کا تیسرا حملہ بہت زوردار تھا۔ انہوں نے بہت جدوجہد کی لیکن 2 مارچ 1972 کو اپنے آپ وامادگی کے اس وقفے کو سپرد کر دیا جسے حروف عام میں موت کہا جاتا ہے۔

ناصر کاظمی کی موت پر سب پریشان تھے۔ شاعر ادیب ،دوست، ٹانگے والے۔ سارٹی سٹال کی منڈلی میں روحوں کا قصہ سنانے والے پہلوان، ٹی۔ ہاؤس کے ویٹر، مزمہ توپ کے پاس بیٹھ کر پیسے گننے والی فقیرنی۔ زراعت کے دفتر میں پہلی تاریخ کو تاش کھیلنے والے کلرک مگر سب سے زیادہ ان کے کبوتروں کا غول مکان کے اوپر پریشانی میں چکر کاٹتا رہا اور غالباً سب سے زیادہ بے چین ان کا شیرازی کبوتر تھا جو انہیں کربلا کی داستان رو رو کر سناتا تھا۔ ناصر کاظمی کی موت کے بعد سے اب تک عنصر کاظمی بلا ناغہ صبح کبوتروں کو دانہ ڈالتا ہے۔ پانی دکھاتا ہے کبوتر اڑتے ہیں چکر لگا کر واپس آتے ہیں لیکن ناصر کاظمی کی جگہ عنصر کاظمی کو دیکھ کر اداس ہو جاتے ہیں۔

میں نے ناصر کاظمی کے جنازے میں شرکت نہیں کی۔ مجھے ڈر تھا میں گیا اور جنازے

کو کندھا دیا تو وہ کہیں اٹھ کر پوچھ نہ لیں۔

"عقیل روبی اور سناؤ کیا حال ہے تمہارا"

مجھے یقین تھا حیران کرنے والا ناصر کاظمی یہ ضرور کرتا تو پھر میں کیا جواب دیتا۔

احمد عقیل روبی کے خاکوں میں ایک بے تکلفی، اسلوب کی شگفتگی اور بات میں سے بات نکالنے کا انداز انہیں ایک انفرادیت بخشتا ہے۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ شخصیت کی پرتیں اس طرح کھولتے ہیں کہ جو شخص اُس شخصیت سے کبھی نہیں ملا ہوتا، وہ بھی محسوس کرتا ہے کہ وہ اسے اچھی طرح جانتا ہے۔ ان کے خاکوں میں نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی جیسی روانی اور معیار ہے۔ خاکے میں افسانوی دلچسپی پیدا کرنا لیکن حقائق کو افسانہ ہونے سے بچانا ان کا فن ہے۔ ہمارے عہد کے خاکہ نگاروں میں ان کی ایک خاص انفرادیت ہے۔ انہوں نے فن خاکہ نگاری کو ایک نیا ذائقہ اور نیا اعتبار عطا کیا ہے۔

ڈاکٹر رشید امجد

احمد عقیل روبی ایک صاحبِ طرز اور صاحب اسلوب نثر نگار ہیں انہوں نے کمال ہنر مندی سے ناصر کاظمی کی ریزہ ریزہ یادوں کو چُن کر ایسا پیکر بنایا ہے جو اُن کی آن میں حرکت پذیر ہو کر کلام کرنے لگتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالکریم خالد

عقیل روبی نے ناصر کاظمی کو ایسے دیکھا ہے جیسے رات کے پچھلے پہر دو قدیم دوست قدیم یاد کے عشق میں کھو کر نئی دنیا کا کھوج لگا رہے ہیں۔ عقیل روبی جس کا خاکہ لکھتے ہیں وہ شخص پڑھنے والے کے قریب آبیٹھتا ہے اور اپنی زندگی کی تصویریں دکھانے لگتا ہے۔

ڈاکٹر ناصر بلوچ

مجھے تو حیران کر گیا وہ
احمد عقیل روبی
پاپا ناصر کاظمی کی پچیسویں برسی 27 مارچ 1997 کو الحمرا ہال نمبر 3 میں منعقد ہوئی۔تقریب ختم ہوئی تو باجی (والدہ مرحومہ / بیگم ناصر کاظمی) عقیل روبی کے پاس گئیں اور انہیں شاباش دیتے ہوئے کہا۔
"ناصر صاحب کی باتیں تو سب نے کیں مگر تم نے ریزہ ریزہ ناصر کاظمی کو اکٹھا کر کے دوبارہ زندہ کر دیا ہے۔عقیل روبی تمہارا شکریہ تم نے 25 سال بعد میرا ناصر کاظمی مجھے واپس کر دیا۔"
میں آنکھوں میں آنسو لے کر باجی کے پاس کھڑا سوچ رہا تھا کہ باجی نے پہل کر دی میں بھی بڑے بھائی عقیل روبی سے یہی کہنے والا تھا۔
حسن کاظمی
دی پرفیکشنسٹس
40/C ماڈل ٹاؤن، لاہور۔فون: 042-5850140
A subsidiary of MHN Communications (Pvt.) Ltd.
Email: Perfectionists@mhn.com.pk
ISBN 969932800-2
9 789699 328008
M.R.P. Rs.190.00